یگانہ روزگار

مولانا عبدالسلام ندوی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

رفیق اعزازی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

ادبی دائرہ، اعظم گڑھ

یگانہ روزگار

مولانا عبدالسلام ندوی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ادبی دائرہ، اعظم گڑھ

[سلسلہ مطبوعات ادبی دائرہ نمبر-۱۵]

- نام کتاب : یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی
- مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
- صفحات : ۲۰۰
- طبع اول : جنوری ۲۰۱۴ء
- ناشر : ادبی دائرہ، اعظم گڑھ
- طباعت : اصیلہ پریس، دہلی
- قیمت : Rs: 250/-
- رابطہ : 9838573645
- ای میل : azmi408@gmail.com

ملنے کے پتے

- ادبی دائرہ، ۱۳/۷/۱۰۷-شائستہ منزل، غلامی کا پورہ
عقب آواس وکاس (رحمت نگر) اعظم گڑھ، ۲۷۶۰۰۱
- دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، شبلی روڈ، اعظم گڑھ، ۲۷۶۰۰۱
- سالم بک ڈپو، یک منارہ مسجد تکیہ، اعظم گڑھ، ۲۷۶۰۰۱

ooo

اخلاق وشرافت کا نمونہ

مولانا عبدالسلام ندویؒ

کے بھتیجے

مولانا عبدالحسیب اصلاحی

کے نام

ترتیب

مقدمہ

پروفیسر خورشید نعمانی
شعبہ اردو، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

اردو ادب کے عناصر خمسہ میں جس طرح سر سید احمد خاں، مولانا حالی، مولوی محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی نعمانی کی اہمیت مسلم ہے، اسی طرح دارالمصنّفین کے عناصر خمسہ میں علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا حمیدالدین فراہی اور مولانا مسعود علی ندوی کی اہمیت مسلم ہے۔ مولانا شبلی تو دارالمصنّفین کے بانی ہیں اور باقی چار بزرگ اس کے اہم ستون کا درجہ رکھتے ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی پر لکھنے کے لیے کسی اعتذار کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہماری ذہنی زندگی کے معماروں میں سے ایک ہیں۔ ان کی مذہبی، دینی اور علمی کتابوں نے ہمارے ذہنوں کو جلا بخشی اور اپنی گمشدہ میراث کو یاد دلانے کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔ ان کی ادبی، تنقیدی اور تحقیقی کتابوں نے ہمارے مذاق سلیم میں بالیدگی پیدا کی اور اس کو سنوارنے ونکھارنے میں اکسیر کا کام کیا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی مولانا شبلی کے ارشد تلامذہ میں سے ایک تھے۔ مولانا کو ان کی صلاحیتوں میں پورا اعتماد تھا۔ وہ جب مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال میں کام کر رہے تھے، دارالمصنّفین قائم ہوا تو انہیں اعظم گڑھ بلالیا گیا، اس وقت سے تادم مرگ انہوں نے اس ادارے کا پیمان وفا باندھا۔

مولانا عبدالسلام ندوی ایک عظیم مصنف ہیں۔ لیکن ہمارے ادب میں ان کے مرتبے و رتبے سے متعلق ان کے شایان شان بہت کم لکھا گیا۔ اس کی وجہ یقیناً ان کی فطری شان استغنا و

بے نیازی اور افتادطبع رہی۔ انہوں نے خود کو عظیم سمجھا اور نہ کبھی لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

مولانا عبدالسلام ندوی کثیرالتصانیف مصنف ہیں۔ اس میں اسوہ صحابہ (دوجلدیں) سیرت عمر بن عبدالعزیز، سیر الصحابیات، تاریخ اخلاق اسلامی، انقلاب الامم، القضا فی الاسلام، ابن یمین ،ابن خلدون، امام رازی، فقرائے اسلام وغیرہ مشہور ہیں۔ ادب میں شعر الہند (دو جلدیں) اور اقبال کامل ان کی مسلمہ تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا نے سیکڑوں دینی وعلمی، ادبی اور فلسفیانہ مقالات بھی لکھے جو ماہنامہ الندوہ، معارف اور ملک کے دوسرے ممتاز رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

ان کی کتاب ''شعر الہند'' اردو تنقید نگاری میں ایک نئے باب کے اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے نقادوں کو فن نقد کے اصولوں کے تعین میں مدد ملی۔ اقبال کامل، اقبالیاتی ادب میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ نثر نگاری کے علاوہ وہ ایک قادرالکلام شاعر، مکتوب نگار، اعلیٰ درجے کے مترجم، اچھے مبصر، بہترین غالب شناس اور سب سے بڑھ کر بحیثیت انسان ایک پیکر شرافت تھے۔

دارالمصنّفین کے تمام رفقاء نے علم وادب کی خاموش خدمت ہی کو اپنا شعار بنایا اور بیجا نام ونمود وتشہیر سے ہمیشہ دور رہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی ذات گرامی ان ہی میں سے ایک ہے۔ یہ میری خوش بختی رہی کہ شبلی نیشنل کالج میں اپنی تعلیم کے دوران اپنے مشفق بزرگ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے ساتھ اپنے دس سالہ قیام میں مولانا عبدالسلام ندوی کے ساتھ ۴ رسال [۱۹۵۳-۱۹۵٦ء] تک قیام کا شب وروز موقع ملا۔ مولانا عبدالسلام ندوی اور شاہ معین الدین احمد ندوی کا دسترخوان بھی ایک تھا، اس لئے ہمہ وقت ساتھ رہتا تھا۔ میں نے انہیں ہر حال میں دیکھا۔

بہ لحاظ شخصیت اور فن مولانا کا مقابلہ انگریزی کے مشہور ادیب الیور گولڈ اسمتھ (Oliour Gold smith) سے کیا جاسکتا ہے۔ اگر مولانا کو شبلی کے تلمیذ رشید ہونے کا فخر حاصل ہے تو گولڈ اسمتھ بھی ڈاکٹر جانس کے حلقہ ارادت پر نازاں تھا۔ دونوں بڑے سادہ مزاج اور نیک نفس تھے۔ جو لوگ ان کی تصانیف کے ذریعہ ان کو جانتے ہیں وہ ان سے ملنے کے بعد اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ وہ ان بلند پایہ کتابوں کے مصنف بھی ہوں گے۔ دونوں کسی سنجیدہ موضوع

پر گفتگو کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے، لیکن اس موضوع پر قلم برداشتہ لکھ سکتے تھے۔ مشہور ایکٹر ڈیوڈ گرگ نے گولڈ اسمتھ کے بارے میں لکھا ہے:

He writes like an angel and talks like a poor paml.

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم زندگی کے آخری دم تک لکھتے رہے۔ معارف ماہ ستمبر ۱۹۵۶ء میں اپنے مضمون ''دلی اور لکھنؤ کی شاعری اور ایک کا دوسرے پر اثر'' کے اختتامیہ پر یوں لکھتے ہیں:

''شعرائے لکھنؤ و شعرائے دہلی کے کلام کا یہ ایک نہایت اجمالی موازنہ ہے۔ تفصیلی موازنہ کے لیے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ شعرائے لکھنؤ و دلی کے کلام کے دو بہترین انتخاب الگ الگ کیے جائیں اور یہ دیکھا جائے کہ تغزل کے بہترین اشعار کس کے ہاں زیادہ ملتے ہیں۔ یہ ایک ادبی اور تنقیدی ضرورت ہے۔ جس کو ہم سے بہتر کوئی دوسرا شخص پورا نہیں کر سکتا، بشرطیکہ موت ہم کو اس کی فرصت واجازت دے۔''

کون کہہ سکتا تھا کہ مولانا کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوگی اور مضمون کی اشاعت کے صرف ۱۸؍دن بعد ظالم موت ان کو ہم سے چھین لے گی۔ ۳-۴؍اکتوبر ۱۹۵۶ء کی درمیانی شب میں وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے اور دنیائے ادب میں ایک ماتم برپا کر گئے:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آج کی دنیا ان بزرگوں کی دنیا سے قدرے مختلف ہے۔ یہ زمانہ cheep publisity اور ادب میں مافیا گردی کا ہے۔ حرام زادگان ادب، ادب پر حاوی ہیں۔ اور نادان برسر منبر دانا بسر دارے کا ماحول ہے۔ ایسے ماحول میں ادب کے خاموش خدمت گزاروں کو لوگ فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اس دور پرفتن میں عظمت کے وہ مینار ہیں جنھوں نے ان بزرگوں کو پردہ خفا سے منصۂ شہود پر لانے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ وہ دارالمصنّفین کے اعزازی رفیق اور اس کی عظمت رفتہ کے شیدائی ہیں۔ دارالمصنّفین کے جن مصنّفین واکابرین پر کم لکھا گیا ہے، ان کو وہ اپنی تصانیف ونگارشات سے time light میں لانا چاہتے ہیں۔ مولانا

عبدالسلام ندوی صاحب مرحوم پران کی یہ کتاب اس دعویٰ کی بین دلیل ہے۔اس سے پہلے علامہ شبلی ،مولانا سید سلیمان ندوی ،شاہ معین الدین احمد ندوی پران کی کتابیں شائع ہوکراہل علم سے تحسین وستائش حاصل کرچکی ہیں۔علامہ شبلی سے متعلق ان کی متعدد کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں،جس میں انہوں نے متعدد نئے مطالعات پیش کئے ہیں۔اب وہ مولانا عبدالسلام ندوی پر اپنے مضامین کا مجموعہ شائع کررہے ہیں۔اس میں انہوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کی شخصیت اورفکروفن کا مندرجہ ذیل دس عنوانات سے جائزلیاہے۔

مولاناعبدالسلام ندوی۔ ایک پیکرشرافت ۔تصانیف وتالیفات ۔تراجم۔ مقالات مقدمے ،تبصرے۔شبلی کےعلمی منصوبوں کی تکمیل میں مولانا عبدالسلام ندوی کا حصہ۔مورخانہ بصیرت۔ادب وانشا۔شاعری۔مکتوب نگاری۔غالب شناسی۔اخیرمیں مولاناعبدالسلام ندوی کے دو مداح مولاناسعید انصاری اور پروفیسرکبیراحمد جائسی کی عبدالسلام شناسی اورہندوپاک میں عبدالسلام شناسی وغیرہ کاجائزہ ہے۔

ڈاکٹر الیاس اعظمی کوزبان وقلم پراچھی دسترس ہے۔اوروہ ترتیب وتہذیب کا بھی اچھا ذوق رکھتے ہیں۔انہوں نے مولانا کی شخصیت اورفکروفن کےمختلف پہلوؤں پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔اس سے بڑی حدتک ان پرکم لکھے جانے کی تلافی ہوگئی ہے۔

خورشیدنعمانی رودولوی

دیباچہ

مولانا عبدالسلام ندویؒ[۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] عبقری اور جینیس[genius] شخص تھے۔ ان کی پوری زندگی علم وادب کی خدمت اور تحقیق وتصنیف میں گذری۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تین بڑی تحریکوں ندوۃ العلماء، الہلال اور دارالمصنّفین سے وابستہ رہے۔

۱۹۰۶ء میں تحصیل علم کے لئے وہ ندوۃ العلما لکھنو پہنچے۔ دوران تعلیم اپنی ذہانت اور تحریری صلاحیت سے تحریک ندوہ کے روح رواں علامہ شبلی نعمانی[۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کو متاثر کیا۔ چنانچہ انہوں نے اسی دور میں ایک خط میں لکھا کہ

> ''ہمارے یہاں یعنی ندوہ میں عبدالسلام نہایت قابل لڑکا ہے، جو غالبًا خالی ہونے والی کرسیوں کا مستحق ہوگا۔'' [مکاتیب شبلی ج۲ص۲۰۷]

پھر مہدی افادی[۱۸۷۰-۱۹۲۱ء] کو لکھا کہ

> ''عبدالسلام نہایت ہونہار ہے۔ وہ پورا مصنف ہوسکتا ہے اور ہوگا۔ انگریزی نہیں جانتا لیکن پڑھ رہا ہے۔ ندوہ اس قسم کے جواہر چمکانے والا ہے۔'' [مکاتیب شبلی ج۲ص۲۰۹]

اور یہ جوہر علامہ شبلی کی زیر تربیت چمکا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے ندوہ میں درس و تدریس کے ساتھ قلمی جولانیاں دکھلائیں اور پے در پے مضامین لکھے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے انھیں ماہنامہ الندوہ لکھنو کا جوائنٹ ایڈیٹر مقرر کیا۔ اس فریضہ کو انھوں نے مارچ ۱۹۱۰ء سے جولائی ۱۹۱۱ء تک بحسن وخوبی نبھایا۔ [مکاتیب شبلی ج۲ص۲۳۹]

ندوہ میں اختلاف وانتشار کے بعد وہ اپنے استاذ کی حمایت میں اس سے دست بردار ہوکر مولانا ابوالکلام آزاد[۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] کی خواہش پر الہلال کلکتہ سے وابستہ ہوگئے اور

جب تک الہلال نکلتا رہا اس سے وابستہ رہے۔ ۱۸؍نومبر۱۹۱۴ء کو الہلال کا آخری شمارہ شائع ہوا، اسی دن ان کے استاذ علامہ شبلیؒ نے اعظم گڑھ میں وفات پائی اور ان کے آخری علمی منصوبے دارالمصنّفین کی تعمیر و تاسیس کے لئے علامہ حمیدالدین فراہیؒ [ف: ۱۱؍نومبر۱۹۳۰ء] کی صدارت میں مجلس اخوان الصفا قائم ہوئی، جس کے ایک رکن مولانا عبدالسلام ندوی بھی نامزد ہوئے۔ چنانچہ وہ کلکتہ کو خیر باد کہہ کر اعظم گڑھ آئے اور پھر ہمیشہ کے لئے دارالمصنّفین کے ہو رہے۔ دارالمصنّفین کے پہلے ناظم مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] مقرر ہوئے تو ۲۵؍نومبر ۱۹۱۴ء کو کلکتہ سے ان کے نام ایک خط میں لکھا کہ

> ''برادر اعظم! میں نے بلا اختلاف آپ کو مولانا مرحوم کا خلیفہ تسلیم کرلیا ہے، اس لئے جس طرح میں حضرت [شبلی] مرحوم کا وفادار خادم تھا آپ بھی مجھے اپنا وفادار خادم تصور فرمائیے۔ میں آپ کے زیر ہدایت وزیر نگرانی ہر ممکن خدمت کے لئے تیار ہوں۔''
>
> [مکاتیب واشعار مولانا عبدالسلام ندوی ص۱۴]

چنانچہ انہوں نے پوری زندگی اس عہد و پیمان کا پاس رکھا۔ دارالمصنّفین میں انھیں جو کام سپرد کیا گیا اسے بحسن وخوبی انجام دیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرت کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اور انھوں نے اسوۂ صحابہ کی تکمیل کا ذمہ اپنے سر لیا اور اسوۂ صحابہؓ و صحابیاتؓ جیسی معرکہ آراء کتابیں لکھیں۔ نیز سیرت وسوانح، شعر وادب، تعلیم و تاریخ اور فلسفہ وکلام وغیرہ متعدد موضوعات پر گراں مایہ کتابیں بھی ان کے قلم سے نکلیں۔ ضرورت کے مطابق کئی کتابوں کے ترجمے کئے۔ اردو شعر و ادب کی تنقیدی تاریخ شعرالہند لکھ کر ادبی ذخیرے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ مقالات کا تو انبار ہی لگا دیا اور جس موضوع پر چاہا لکھا۔ ماہنامہ معارف کے آج تک وہ بلاشرکت غیرے سب سے بڑے مقالہ نگار ہیں۔

یہی نہیں مولانا سید سلیمان ندوی کی ہجرت [پہلے بھوپال پھر پاکستان] کے بعد ان کے جانشینوں کے بھی وہ اسی طرح وفادار رہے جس طرح مولانا سید سلیمان ندوی کے رہے۔ وہ دارالمصنّفین کے کاموں میں پیش پیش رہے اور تقریباً تمام علمی منصوبوں میں شریک کار رہے۔ حتیٰ

کہ سیرت نبوی کی تالیف میں بھی حصہ لیا۔ آخری دور میں جب ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے تھے، دارالمصنّفین میں تاریخ ہند کی تدوین کا منصوبہ بنا تو انھوں نے ایک بڑی عمدہ کتاب ''ہندوستان کی تمدنی تاریخ''، لکھی، جسے سید صباح الدین عبدالرحمٰن [۱۹۱۱–۱۹۸۷ء] نے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے [مطبوعہ دارالمصنّفین۔۱۹۶۳ء] میں شامل کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے آخری سانس تک دارالمصنّفین کی خدمت کی اور اپنے استاذ کے آستانے پر جان ہی دیدی، بلکہ مر کر بھی اس سے جدا نہ ہوئے۔ ایسی دلکش، دلآویز اور مثالی شخصیتیں ہماری تاریخ میں کم ملتی ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی صاف وشفاف زندگی میں بصائر وعبر اور فکر ونظر کے متعدد جلوے ہیں جو دامن دل کھینچ لیتے ہیں۔ اس ناچیز کو علامہ شبلی کے ساتھ مولانا عبدالسلام ندوی کی دلآویز شخصیت سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقتاً فوقتاً ان پر مضامین ومقالات لکھتا رہا۔ ۱۹۹۵ء میں ایک مفصل مقالہ ''مولانا عبدالسلام ندوی تصنیفات وتالیفات اور تراجم'' کے عنوان سے سہ ماہی فکر ونظر اسلام آباد [جولائی-ستمبر ۱۹۹۵ء] میں لکھا تو اسے اہل علم نے بہت سراہا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب نہ مولانا عبدالسلام ندوی پر ملک میں کوئی سمینار منعقد ہوا تھا اور نہ ممبئ میں مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس میں مولانا کی تصنیفات کے تعارف کے ساتھ ان کے کئی طویل اور اہم مقالات کی نشاندہی کر کے یہ خواہش کی گئی تھی کہ انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن کے قیام کے بعد اس کے لائق ڈائرکٹر نے اس سلسلہ کے بعض مضامین کو کتابی صورت میں شائع کیا، لیکن اب بھی بعض ایسے گراں قدر مضامین ومقالات ہیں جنہیں کتابی صورت میں اہل علم اور شائقین کی خدمت میں پیش کرنا ضروری ہے۔ راقم کا وہ طویل مقالہ اس کتاب میں قدرے ترمیم واضافہ کے ساتھ شامل ہے۔

زیر نظر کتاب ''یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی'' میری مستقل تصنیف نہیں بلکہ یہ میرے ان مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے جو نادرہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی کی دلآویز شخصیت اوران کے فضل وکمال پر گذشتہ ۱۵-۱۶/ برسوں میں مختلف مواقع پر لکھے گئے۔ البتہ اس میں چند

مضامین کا اضافہ کر کے یہ کوشش کی گئی ہے کہ کتاب میں مولانا عبدالسلام ندوی کی سیرت وشخصیت، حیات وخدمات اور فکر ونظر کے تمام بنیادی پہلو آجائیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی اپنے استاذ علامہ شبلی نعمانی کے علمی منصوبوں کی تکمیل میں زندگی بھر منہمک رہے۔ ایک مقالہ میں اس کی سرگذشت ہے۔ تصنیفات وتالیفات کے ذکر وتعارف کے ساتھ ان کی ترجمہ نگاری، مقالہ نگاری، مقدمہ نگاری اور تبصرہ نگاری کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ نیز ان کی ادبی، تنقیدی اور تاریخی بصیرت اور شاعری ومکتوب نگاری وغیرہ کا ذکر وجائزہ بھی اس میں آگیا ہے۔

تدبر وتفکر مولانا عبدالسلام ندوی کو اپنے استاذ علامہ شبلی سے ورثے میں ملا تھا۔ انہوں نے متعدد موضوعات پر غور وخوض کیا اور اپنے مطالعہ اور فکر وتحقیق کی بنیاد پر جو نتائج اخذ کئے یا جس نتیجے پر پہنچے، اپنی تحریروں میں ان کا برملا اظہار کیا۔ انہوں نے اگرچہ خود کو مفکر کے طور پر کبھی پیش نہیں کیا اور نہ دنیا نے ان کے افکار پر توجہ دی، تاہم قوم وملت، تعلیم وتربیت اور علم وادب کے متعدد پہلوؤں پر ان کے آراء وخیالات بڑے اہم اور قابل قدر اور لائق استفادہ ہیں، اس لئے ان کی تصنیفات کے تعارف میں ان کے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں تاکہ ان کی فکر ونظر کے اساسی پہلو انہیں کے قلم سے سامنے آجائیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی آزاد ہندوستان کے پہلے اقبال شناس ہیں۔ اقبال کامل ان کی بڑی اہم تصنیف ہے۔ ان کی اقبال شناسی پر متعدد اہل قلم نے روشنی ڈالی ہے۔ البتہ ان کی غالب شناسی کا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ اس کتاب میں ان کی غالب شناسی کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

عبدالسلام شناسی میں دو نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک پروفیسر کبیر احمد جائسی [۱۹۳۶-۲۰۱۳ء] کا جنھوں نے عبدالسلام شناسی کو اپنی زندگی کا مشن ہی بنالیا تھا۔ انھوں نے مولانا پر متعدد مضامین اور کتابیں لکھیں۔ ایم. فل. اور پی ایچ. ڈی. کے بعض مقالات لکھوائے۔ ان کی دو کتابوں کو ایڈٹ کر کے شائع کرایا اور طرح طرح سے عبدالسلام شناسی کی ترغیب دلاتے رہے۔ ایک مضمون میں ان کی عبدالسلام شناسی کا ذکر ہے۔ ایک مقالے میں مولانا کے ایک اور مداح وشیدائی مولانا سعید انصاری نشتر [۱۸۹۴-۱۹۶۲ء] کی عبدالسلام شناسی کی تفصیل ہے۔ آخر

میں ایک صدی پر مشتمل عبدالسلام شناسی کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی کے حالات اور کارناموں کا ابتک بھرپور جائزہ نہیں لیا گیا بلکہ مختلف اہل قلم نے ان پر جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے فضل وکمال کے کسی ایک پہلو کا مطالعہ ہے۔اس لئے ''حیات عبدالسلام'' کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔ یہ مجموعہ ''حیات عبدالسلام'' کی کمی پوری تو نہیں کرسکتا، تاہم اس میں مولانا عبدالسلام ندوی کی سیرت وشخصیت اور کارناموں کا ایک عمدہ مرقع ضرور آ گیا ہے۔یقین ہے اس سے مولانا مرحوم کی شخصیت سوانح اور ان کے افکار وخیالات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

یہ دیباچہ لکھتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی کے عاشق زار مرحوم پروفیسر کبیر احمد جائسی کی بے طرح یاد آ رہی ہے۔ان کی شفقت آمیز یادیں اور محبت بھری باتیں نہان خانہ میں گردش اور دل بدماغ میں اضطراب پیدا کررہی ہیں۔وہ ہوتے تو یقیناً بہت خوش ہوتے اور یہ حقیر کوشش داد کی مستحق ہوتی۔

علامہ شبلی کے تلامذہ کا ذکر بھی شبلی شناسی کا ایک حصہ ہے۔۱۸؍نومبر۲۰۱۴ء کو شبلی کی وفات کو سو سال ہو جائیں گے۔اس موقع پر اس مجموعہ مضامین کی اشاعت کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ یقین ہے یہ مجموعہ بھی دبستان شبلی کی خدمات اور اس کی فکر ونظر کی تفہیم میں معاون ہوگا۔

محمد الیاس الاعظمی

ادبی دائرہ، اعظم گڑھ — ۲۲؍نومبر۲۰۱۳ء

مولانا عبدالسلام ندویؒ

ادیب شہیر مولانا عبدالسلام ندویؒ ۱۶؍فروری ۱۸۸۳ء کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں علاءالدین پٹی میں پیدا ہوئے۔علاءالدین پٹی شہر اعظم گڑھ سے ۱۰؍کلومیٹر شمال میں قصبہ بلریا گنج سے متصل واقع ہے۔یہ راج پوتوں کا گاؤں تھا۔مولانا کے آباءواجداد بھی راج پوت نسل سے تھے جو مولانا سے کئی پشت پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔قرب و جوار کے نومسلم مواضعات کی طرح یہ گاؤں بھی معمولی زمینداری اور نیل کی تجارت کی وجہ سے کسی قدر خوشحال تھا۔باوجود اس کے تعلیم کا عام رواج نہ تھا، البتہ مولانا عبدالسلام ندوی کا خانوادہ تعلیم سے بے بہرہ نہ تھا۔مولانا کے دادا شیخ بدھو [ف:۲۲؍رمضان ۱۳۰۵ھ] اگرچہ غیر تعلیم یافتہ تھے لیکن والد بزرگوار شیخ دین محمد نے مروجہ دستور کے مطابق فارسی پڑھی تھی اور تجارتی ضروریات کے لئے ہندی اور حساب سیکھا تھا۔ان کے ایک چچا شیخ نور محمد نے شرح جامی تک تعلیم حاصل کی تھی۔ان کی عربی استعداد اس قدر عمدہ تھی کہ انہوں نے بعض رسائل قلم بند کئے جواب کہیں دستیاب نہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے ابتدائی تعلیم گھر پر مولوی سید امداد علی سے حاصل کی جو موضع خانقاہ کے باشندہ تھے اور جنہیں مولانا کے والد نے ۲؍روپیہ ماہوار پر اتالیق مقرر کیا تھا۔تیرہ، چودہ سال کی عمر تک انہوں نے گاؤں میں فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، اسی زمانہ کم سنی میں ان کی شادی اہل حدیث عالم مولوی عبداللہ چاند پاروی [تلمیذ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی] کی دختر سے ہوئی۔ فارسی کی منتہی کتب مولانا نے اپنے خسر سے ان کے گھر موضع چاند پار میں دو برس رہ کر پڑھیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی بڑی بہن مولوی محبوب الرحمٰن کلیم [۱۸۶۸-۱۹۲۵ء] کے نکاح میں تھیں۔وہ موضع جیراج پور کے رہنے والے اور کان پور مشن کالج میں زیر تعلیم تھے۔حصول تعلیم کے لئے مولانا عبدالسلام ندوی ان کے ساتھ کان پور گئے، انہیں کے ساتھ رہے اور اپنے

ایک ہم وطن مولوی بخشش احمد [محمد احمد لہراوی] سے جو مشن کالج میں مدرس تھے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر کلیم صاحب ہی کے ساتھ آگرہ گئے اور وہاں کی جامع مسجد کے مدرسہ کے ایک مدرس مولوی رمضان سے کافیہ، شرح جامی اور قدوری وغیرہ پڑھیں۔ کلیم صاحب سینٹ جانس کالج آگرہ سے بی۔اے کرنے کے بعد جب محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ چلے گئے تو مولانا نے غازی پور کی مشہور درس گاہ مدرسہ چشمہ رحمت کا رخ کیا۔ یہاں بھی انہوں نے چشمہ رحمت کے بجائے اپنے ایک عزیز اور ہم وطن عالم مولانا شبلی فقیہ جیراج پوری[پ:۱۸۷۲ء] سے متوسطات تک کی کتابیں پڑیں۔ یہیں ایک ودسرے ہم وطن مدرس مولوی لعل محمد رسول پوری [ف:۱۹۲۲ء] صدر مدرسہ چشمہ رحمت سے میر زاہد وغیرہ کے جستہ جستہ مقامات سنے۔ یہاں سے انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا، جہاں علامہ شبلی معتمد تعلیم تھے اور جن کے فضل و کمال کا شہرہ ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں وہ ندوہ میں درجہ پنجم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں تکمیل کے بعد ایک سال مزید رہ کر تکمیل ادب کیا اور ۱۹۱۰ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ ندوہ سے پہلے کی مولانا کی تمام تر تعلیم مدارس کی چہار دیواری سے باہر ماہرین فن سے ہوئی۔ یہی قدیم طرز تعلیم تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی اس طرز تعلیم کو پسند کرتے تھے اور اسے مدارس کی تعلیم سے بہتر خیال کرتے تھے۔(۱)

تحصیل علم کے بعد علامہ شبلی کی ایماء سے وہ ندوہ ہی سے وابستہ ہو گئے۔ ندوہ میں وہ عربی ادب کے استاذ اور ماہنامہ الندوہ کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے، یہیں علامہ شبلی نے سیرۃ النبی کی تصنیف میں انہیں اپنا لٹریری اسسٹنٹ بنایا۔ ماہنامہ الندوہ کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے انہوں نے جو خدمات انجام دیں وہ ندوہ کی تابناک تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ افسوس کہ ندوہ نے اپنے اس مایہ ناز فرزند کو بھلا دیا۔ تاریخ ندوہ ان کے ذکر سے خالی ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی میں تصنیف و تالیف کا فطری اور خداداد ملکہ تھا۔ وہ جس سال ندوہ میں داخل ہوئے اسی سال مئی ۱۹۰۶ء میں ایک مضمون ''تناسخ'' لکھا، جسے علامہ شبلی نے بہت پسند کیا اور اس کا ذکر ماہنامہ الندوہ کے شذرات میں اس طرح کیا:

''قوم کو ایسے افراد کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت ہمیشہ رہے گی جو اسلامی

عقائد ومسائل اور اسلامی علوم وفنون سے محققانہ واقفیت رکھتا ہو اور زمانہ حال کے موافق اس سے کام لے سکتا ہو......... یہ گروہ نہ مسلم انگریزی کالجوں سے اور نہ عام عربی مدارس سے تیار ہوسکتا ہے بلکہ اس قسم کی تعلیم سے پیدا ہوسکتا ہے جو ندوہ کا مطمح نظر ہے۔ ندوہ کے مدرسہ کو قائم ہوئے صرف آٹھ نو سال ہوئے ہیں ان کا اندازہ ان مضامین سے ہوا ہوگا جو فن حدیث اور امام بخاری کے حالات پر الندوہ میں شایع ہو چکے ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ مضمون بھی ہے جو آج کے پرچے میں درج کیا جاتا ہے۔ یہ مضمون ایک طالب علم عبدالسلام نام کا ہے جو درجہ ششم میں تعلیم پاتا ہے۔ اب تک جن طلبہ نے مضامین لکھے ان کو تصنیف وتالیف کی کوئی خاص تعلیم نہیں دی گئی تھی لیکن بہت جلد ایک خاص صیغہ اس غرض سے ندوہ میں قائم کیا جائے گا اور جہاں تک مجھ سے ممکن ہوگا اس صیغہ میں مدد دوں گا۔''(۲)

یہ مولانا عبدالسلام ندویؒ کا پہلا مضمون تھا۔ علامہ شبلی نے اس کی تعریف وتحسین کی۔ پانچ روپئے بطور انعام دئے اور جوہر قابل سمجھ کر تصنیف وتالیف کے لئے تربیت شروع کی۔ اس زمانہ میں علامہ شبلی نے اپنے احباب ومعاصرین کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں متعدد مقامات پر ان کی علمی صلاحیتوں کی تحسین وستائش کی ہے۔ علامہ شبلی نے ان کے ایک کامیاب مصنف ہونے کی پیشن گوئی کی تھی (۳) جو بعد میں اس طرح پوری ہوئی کہ ان کا شمار اردو کے چند ممتاز ترین مصنّفین اور انشاء پردازوں میں ہوا۔

ماہنامہ الندوہ سے جن لوگوں نے عزت وعظمت پائی ان میں مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے علاوہ مولانا ابو الکلام آزاد کا نام بھی شامل ہے۔ یہیں مولانا عبدالسلام ندوی کے مولانا آزاد سے دوستانہ مراسم قائم ہوئے جو مدۃ العمر قائم رہے۔ اسی تعلق خاطر کی بنا پر مولانا ابوالکلام آزاد نے انہیں کلکتہ بلالیا۔ وہاں انہوں نے آخر تک الہلال کی ادارت میں حصہ لیا۔ الہلال کے چمکانے میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے۔ خاص طور سے ان کے فلسفیانہ مضامین نے الہلال کی اہمیت میں اضافہ کیا۔

۱۸/نومبر۱۹۱۴ءکوعلامہ شبلی نے وفات پائی۔تین دن بعد ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل کے لئے مجلس اخوان الصفا کا قیام عمل میں آیا۔علامہ حمید الدین فراہی نے صدارت قبول فرمائی۔اس وقت شبلی کے عزائم کی تکمیل کا جن لوگوں نے عزم بالجزم کیا ان میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی[۱۸۸۹-۱۹۶۴ء] کے ساتھ مولانا عبدالسلام ندویؒ کا نام بھی سر فہرست ہے۔علامہ شبلی کے تخیل اور منصوبوں کے مطابق دارالمصنّفین کے کاموں کا آغاز ہوا تو مولانا عبدالسلام ندویؒ کلکتہ سے اعظم گڑھ آئے اور پھر مرکر ہی اس سے جدا ہوئے۔

مولانا عبدالسلام ندوی خداداد صلاحیتیوں کے مالک تھے۔ان کا علم سراسر وہبی تھا۔ انہوں نے مختلف موضوعات مثلاً قرآن،حدیث،فقہ،فلسفہ،کلام،تاریخ،تذکرہ،تصوف،سیرت، سوانح،تعلیم وتربیت اور شعروادب پر خامہ فرسائی کی اور بے شمار تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن رقم طراز ہیں:

> ''ان کا پہلا مضمون ۱۹۰۶ءمیں شائع ہوا اور جب ۴/اکتوبر ۱۹۵۶ءکو ان کا انتقال ہوا تو اس روز بھی ان کا قلم ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔اس پچاس سال میں قرآن پاک،تفسیر،سیرت،کلام،فلسفہ،منطق،نفسیات،اجتماعیات، تاریخ اور شعروادب شاید ہی کوئی ایسا فن رہ گیا ہو جس کے کسی نہ کسی گوشہ پر ان کا قلم نہ چلا ہو۔علم وفن کا اتنا طویل المدت خدمت گزار اردو زبان میں شاید ہی کوئی گذرا ہو۔''(۴)

ان کے قلم سے اسوۂ صحابہؓ[دوجلد] اسوۂ صحابیاتؓ،تاریخ اخلاق اسلامی،سیرت عمر بن عبدالعزیز،اقبال کامل،شعرالہند[دوجلد] امام رازی،ابن یمین،حکمائے اسلام[دوجلد] فقرائے اسلام،القضا فی الاسلام،تاریخ الحرمین الشریفین،وغیرہ بلند پایا کتابیں نکلیں اور انہیں زندہ جاوید کر گئیں۔

ابن خلدون،انقلاب الامم،اسلامی قانون فوجداری،التربیۃ الاستقلالیہ،تاریخ فقہ اسلامی اور فطرت نسوانی مختلف زبانوں کی اہم اور علمی کتابوں کے تراجم ہیں۔ان کے علاوہ ان کی سات اہم کتابیں شایع نہ ہوسکیں۔افسوس گردش ایام نے ان کے نقوش بھی دھندلا دیئے۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے علامہ شبلی کے اسلوب نگارش کو اختیار کیا اور اس میں وہ بقول مولانا سعید انصاری ''سب سے زیادہ کامیاب رہے۔''(۵) جناب صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے لکھا ہے کہ ان کی بعض تحریریں تو ایسی ہیں کہ اگر نہ بتایا جائے تو یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ وہ مولانا شبلی کی ہیں۔(۶) اور ایک معاملہ میں تو وہ سب سے منفرد تھے یعنی ان کا مسودہ ہی مبیضہ ہوتا تھا جس میں قطع و برید اور ترمیم و اضافہ کی کوئی ضرورت نہ پیش آتی۔ مولانا کو اپنی تحریروں پر بہت کم نظر ثانی کی ضرورت پڑتی تھی۔

مولانا ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے اور شمیم تخلص کرتے تھے۔ ان کی غزلیں ماہنامہ معارف کی قدیم فائلوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان کا یہ ذوق مولوی محبوب الرحمٰن کلیم کی صحبت و تربیت کا نتیجہ تھا، جس کو مولانا عبدالاحد شمشاد فرنگی محلی [۱۸۴۹-۱۹۱۷ء] علامہ شبلی نعمانی، اقبال سہیل [۱۸۸۶-۱۹۵۵ء] سید سلیمان ندوی، جگر [۱۸۹۰-۱۹۶۰ء] اصغر [۱۸۸۴-۱۹۳۶ء] اور مرزا احسان احمد [۱۸۹۵-۱۹۷۲ء] وغیرہ شعراء کی صحبتوں سے جلا ملی۔ وہ لکھنؤ کی شاعری کو دلی کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے اور خود جلال لکھنوی [۳۰-۱۸۳۱-۱۹۰۹ء] کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ گو ان کے کچھ اشعار داغ و امیر کے رنگ میں بھی ہیں۔

شخصی اعتبار سے مولانا نہایت شریف، نیک اور معصوم صفت تھے۔ شہرت، نام و نمود اور صلہ و ستائش سے ہمیشہ بے پرواہ ہے لیکن ان کے قابل قدر علمی و ادبی اور تاریخی کارناموں نے ان کو شہرت کے دربار میں بقائے دوام کی نعمت بخشی۔ ان کا کل سرمایہ حیات دارالمصنّفین تھا اور وہ ۴/اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔ مزار شبلی سے چند گز کے فاصلے پر ان کی آخری آرام گاہ ہے۔

کتنا بلند ظرف تھا عالی وقار تھا
سرمایہ دار فن تھا مگر خاکسار تھا

ان کی وفات کی خبر سے ادبی دنیا میں صف ماتم بچھ گئی۔ اہل قلم نے ان پر مضامین لکھے اور آنسو بہائے۔ شعرا نے مرثیے اور قطعات کے ذریعہ اظہار غم کیا۔ ان میں یحیٰی اعظمی [۱۹۰۶-۱۹۷۲ء] شان الرحمٰن ولی، عطا کاکوی [پ: ۱۹۰۴ء] اور قاضی معراج دھول پوری [ف: ۱۱/اکتوبر

١٩٦٣ء] کے قطعات ومراثی خاص طور سے لائق ذکر ہیں۔ یہاں انہیں اس لئے نقل کیا جاتا ہے کہ اس سے شعراء کے درمیان ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

یحیٰ اعظمی:

ہے جہان علم و دانش میں یہ ماتم کا مقام — اٹھ گئے بزم ہنر سے مولوی عبدالسلام
رند سرخوش بزم شبلی کے حریف بادہ نوش — خواجہ تاش و ہم نشین سید جنت مقام
وہ ادیبِ کہنہ سال و پیر دانائے ہنر — خازن اسرار شبلی ، خاتم علم الکرام
حاصل فکر و نظر تھی جس کی ہر تحقیق فن — دور حاضر میں سند تھا جس کا ہر قول وکلام
بزم دانش میں تھا جس سے اعتبار علم وفن — عصر نو میں اجتہاد فکر تھا جس کا مقام
محفل شبلی کا وہ رنگیں طراز اہل قلم — ہو گیا اس دور میں حسن رقم جس پر تمام
مرتے دم تک جس نے رکھا شغل قرطاس وقلم — ہے یہ اس استاذ فن کی زندگی کا اختتام
وہ مصنف اسوۂ اصحابؓ و شعرالہند کا — وہ محقق فکر رازیؔ کا ، غزالی کا امام
وہ مفکر وہ شہید جستجوئے راز ، جو — آخری دم تک رہا راہ ہنر میں تیز گام
اب کہاں ہے آہ وہ فرزانۂ شوریدہ سر — اب کہاں ہے آہ وہ دیوانۂ عالی مقام
جس کی سادہ زندگی اخلاص کی تصویر تھی — جس کی ہر شوریدگی تھی درخور صد احترام
ہر ادا معصوم جس کی ، ہر خطا جس کی صواب — جس کو حاصل تھا زمانہ میں قبول خاص و عام
وہ مسافر چلتے چلتے کس لیے اب رک گیا — عرصۂ ہستی میں تھا جو مستقل گرمِ خرام
تھا ابھی درپیش صد افسوس دہلی کا سفر — ہو رہا تھا جس کی خاطر آہ کیا کیا اہتمام
سوئے منزل کس لیے اب وہ قدم اٹھتے نہیں — ہم نے تو دیکھا تھا نہ ان کو کبھی یوں سست گام
تھی حیات آخریں کی اب یہی اک آرزو — زندگی کا تھا رہا باقی یہی بس ایک کام
حیف اب عزمِ علی گڑھ ہے نہ دہلی کی تڑپ — ہو گئے عبدالسلام اب عازم دارالسلام
کر رہے تجھ کو رخصت آہ اب کس شان سے — تیرے یاران قدیم و ہمنشینانِ کرام

دوش پر تجھ کو لیے جاتے ہیں اور آنکھیں ہیں تر

ہے زباں پر الفراق و الوادع و السلام

شان الرحمٰن ولی:

آج ہے اعظم کدہ کس لئے ماتم کدہ　　محفل شبلی اداس بزم سلیماں نڈھال
ہوگئے عبد السلام ساکن دارالسلام　　شاہد مقصود کا ہو گیا حاصل وصال
صاحب نقد و نظر نکتہ شناس ہنر　　بلبل رنگیں نوا طوطی شیریں مقال
علم وادب کا دیار کیوں نہ ہو ماتم گسار　　علم کی محفل خموش نقد کی میزاں نڈھال
محفل شعروادب درہم و برہم ہے اب　　مزرع تنقید ہے، مضمحل و پائمال
آج بساط سخن سوگ میں ہے پر شکن　　ماہر تنقید کا بس کہ ہوا انتقال
فیض تھا اس کا بن گئے کتنے ادیب　　خامہ معجز نما کی تھی یہ روشن مثال
ذوق سخن تھا بلند طرز ادا دل پسند　　فکر رسا میں نہ تھاشائبہ ابتذال
فقر و قناعت سے کی اپنی بسر زندگی　　آگے کسی کے نہ بڑھا اس کا دست سوال
صبر کا ہے یہ محل اے دل مضطر سنبھل　　شور وفغاں ہے حرام گریہ حسرت حلال
اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا　　یعنی ہر اوج کمال کو ہے مقدر زوال
سال وفات اے ولی لکھ دو بخط جلی　　دل سے بہ آہ حزیں مردفرشتہ خصال(۷)

عطا کاکوی:

رخصت ہستی از جہاں بر بست آں عبدالسلام　　کزخم تصنیف او صد رند صہبا نوش بود
صاحب اقبال کامل نقد سنج شعر ہند　　از وجودش مجلس علم و ادب پر جوش بود
ازنوائے ساز او صد انجمن در ہا و ہو　　از صدائے جام اوگلبانگ نوشا نوش بود

قصر علم وفن ہمہ تاریک شد از مرگ او
حسرتا واحسرتا۔ ''شمع ادب خاموش بود(۸) ۱۳۷۶ھ

قاضی معراج دھول پوری　　[ا]

ہوکے رخصت مولوی عبدالسلام　　اک جہاں کو کر گئے ،وقف الم

سن یہ ہجری دل حزیں معراج لکھ   اوج کو کب سبز ۂ باغ ارم

۱۳۷۶ہجری

[۲]

چل دیئے احباب کی محفل سے آج   حسن منزل، نیک باطن، خوش کلام

عیسوی میں سال اے معراج لکھ   خوش جہاں ماہ بہشت عبدالسلام

۵۶عیسوی

[۳]

چل بسے بزم جہاں سے مولوی عبدالسلام   ہوگئے دل رنج فرقت سے دو نیم

سن مسیحی خامہ معؔراج لکھ   نور دودراں داخل خلد نعیم

۵۶عیسوی

[۴]

کر گئے دنیا کو وقف اضطراب   رونق ہندوستاں عبدالسلام

لکھے ہلالی سال میں معؔراج راز   نیک آشیاں خلد عبدالسلام

۷۶ہجری

معراج دھول پوری نے کئی تاریخی مادے بھی نکالے:

<u>فرشتہ تمثال</u>

۱۹۵۶ء

<u>مواج طینت مصنف ''شعر الہند'' کی وفات</u>

۱۹۵۶ء

<u>بسم اللہ الغنی المولٰی</u>

۱۳۷۶ھ

<u>مر الغفار الحبیب</u>

۱۳۷۶ھ

برگزیدہ اطوار ہندوستانی فاضل

۱۹۵۶ء

عوامی مرتبت، مرجع الانام، مہبوب جہاں مرد

۱۹۵۶ء

رفعت پناہ مشہور ادیب

۱۳۷۶ھ

شیریں گفتار قابل قدر محقق

۱۹۵۶ء

دیں پناہ فیض، بلند پایہ مصنف

۱۳۷۶ھ

افتخار مآب ملک مولانا عبدالسلام ندوی چل بسے!

۱۹۵۶ء

اعظم گڑھ کے ایک نعت گو شاعر حکیم سید مصلح الدین ثاقب [صاحب تجلیات رحمت عالم] نے فارسی میں تاریخ وفات کہی:

کیف شراب و لذت شراب مدام رفت　　ساقی نماند و مطرب رنگیں کلام رفت
آہ فغاں بگوش خواص و عوام رفت　　شورے است در زمانہ کہ عبدالسلام رفت
وا حسرتا ! مورخ عالی مقام رفت　　افسوس ! آں دبیر و ادیب ہمام رفت
ضبط از جگر قرار ز دل دل زکام رفت　　از ما چوں نام نامی عبدالسلام رفت
جلوہ شناس صبح و ادا دان شام رفت　　شب تیرہ گشت وحیف کہ ماہ تمام رفت
صد حیف نکتہ دان علوم سلف نماند　　واں کاتب حیات صحابہ کرام رفت
آں یادگار حضرت شبلی کجا است حیف !　　در وا! ز ہر فن ادب را امام رفت

ثاقب زمام صبر و سکونم زدست رفت
عبدالسلام آہ بدر السلام رفت

حواشی

(۱) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۱۱۵

(۲) ماہنامہ الندوہ لکھنؤ۔ مئی ۱۹۰۶ء ص ۱-۲

(۳) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۲۰۹، مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنّفین۔ اعظم گڑھ ۱۹۷۱ء

(۴) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، میرے مولوی صاحب، مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں ص ۵۴

(۵) سعید انصاری، مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں ص ۲۷

(۶) میرے مولوی صاحب، ص ۵۸

(۷) ماہنامہ معارف نومبر ۱۹۵۶ء ص ۳۹۴-۳۹۵

(۸) ایضاً

ایک پیکر شرافت

مولانا عبدالسلام ندویؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سب سے روشن اور تابناک پہلو ان کی شرافت، مروت، سادگی، شائستگی اور وضع داری تھی۔ وہ انتہائی سادہ اور منکسر المزاج تھے۔ حلم، عفو و درگذر، صبر و رضا اور قناعت سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ شرافت کے ایک ایسے پیکر تھے جس کی مثال ناممکن تو نہیں البتہ محال ضرور ہے۔ دراصل وہ معصوم صفت اور فرشتہ خصلت انسان تھے۔ شاید ہی زندگی میں کسی سے بحث و تکرار ہوئی ہو اور کسی کا دل دکھایا ہو یا ان سے کسی کو گلہ و شکوہ رہا ہو۔

وہ علامہ شبلی کے تربیت یافتہ، مولانا ابوالکلام آزاد کے رفیق خاص اور مولانا سید سلیمان ندوی کے دست راست رہے۔ ملک کے نامور مصنف، ادیب و انشاپرداز اور نقاد تھے۔ ان کے قلم سے اسوۂ صحابہؓ و صحابیات، اقبال کامل اور انقلاب الامم جیسی اہم اور معرکہ آرا کتابیں نکلیں۔ ان کا شمار اردو کے چند ممتاز ترین مصنفوں اور نقادوں میں ہوا۔ شعر الہند جیسی معرکہ آراء کتاب نے انہیں بے پناہ شہرت دی مگر ان سب باتوں کا انہیں کبھی احساس نہیں ہوا۔ انہوں نے عزت و شہرت اور صلہ و ستائش کی کبھی پرواہ نہ کی۔ بے نیازی، قناعت، توکل، اور صبر و شکر نے ان کی سیرت و شخصیت کو نکھارا اور اس طرح نکھارا کہ بے خودی کی ساری کیفیات ان میں درآئیں۔ جن لوگوں کے درمیان انہوں نے زندگی بسر کی وہ تصوف ناآشنا تھے، ورنہ انہیں صوفی اور مجذوب قرار دیا جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک علمی مجذوب تھے۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ دور آخر میں جذب و کیف میں ڈوبی ان کی باتوں کو محض مجذوب کی بڑ سمجھا گیا اور ان کی زحال مستی مکن تغافل پر غور نہیں کیا گیا۔ البتہ مولانا عبدالغنی پھول پوریؒ انہیں صوفی اور مجذوب کہا کرتے تھے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ وہ راتوں کو چہل قدمی کرتے اور یہ مصرع ان کی

زبان پر ہوتا:

تم چپکے چپکے لئے جاؤ چٹکیاں

ان کی ان عارفانہ حرکتوں کی بنا پران کے احباب انہیں بھولے بھالے انسان سے تشبیہ دیتے اور لطف لیتے رہے اور ان کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ وہ علم وفضل کے بلند مقام پر تھے۔ان کی وفات پر مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی[۱۹۰۳-۱۹۷۴ء] نے جو طویل مضمون لکھا تھا،اس سے ان کی پر عظمت شخصیت کا پورے طور پر اندازہ ہوتا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

> وہ ایک علمی مجذوب اور اپنی خصوصیات میں یگانہ تھے۔ان میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو اس زمانہ میں ناپید ہیں یا کم از کم ان کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔وہ نہایت نیک سیرت، بےنفس اور مرنجاں مرنج انسان تھے۔ان کی ذات سے کبھی کسی کو ادنیٰ تکلیف بھی نہیں پہونچی۔ان میں ایذارسانی کا مادہ ہی نہ تھا۔حقوق العباد سے ان کا دامن اتنا پاک تھا کہ کسی کا ادنیٰ حق بھی ان کے ذمہ نہ تھا اور ان کے رفقاء ومتوسلین میں مشکل ہی سے کوئی ایسا شخص ہوگا جس کے ذمہ ان کا کوئی حق نہ ہو۔معاملات کے اس قدر صاف تھے کہ کسی کا ایک حبہ بھی باقی نہ رکھتے تھے۔ بازار کے معمولی حساب کتاب کے سوا ان کو کسی سے قرض لینے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی تھی۔ تنخواہ ملنے کے بعد سب سے پہلے حساب چکاتے تھے۔ جب تک پورا حساب صاف نہ ہوجاتا ان کو چین نہ آتا، حتیٰ کہ اگر دھوبی اور مہتر وغیرہ وقت پر نہ پہونچتے تو گھر جاکر ان کی تنخواہ دے آتے۔(۱)

مولانا طبعاً شریف اور نیک نفس تھے۔ پوری زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا کہ کسی سے کوئی معاملہ ہوا ہو۔ بے نیازی اور ایسی بے نیازی کہ بڑے سے بڑا کوئی معاملہ ہو وہ اس کی طرف سرے سے توجہ ہی نہ دیتے تھے اور وہ امور ومعاملات جہاں ان کی قانع اور بے نیاز زندگی کے شیشے کو ٹھیس پہونچ سکتی تھی، لاحول ولاقوۃ کہہ کر گذر جاتے۔ دراصل شرافت، قناعت اور بے نیازی کی خوبیوں نے رشک وحسد، کینہ وکدورت، صلہ وستائش اور ہوس جاہ ومنصب جیسی

آلائشوں سے ان کے سینہ کو پاک کر دیا تھا۔ اصلاً یہی ان کی شخصیت کی عظمت ہے۔ میجر علی حماد عباسی [ف: ۱۱؍جولائی ۱۹۹۷ء] نے سچ لکھا ہے کہ

''ان کی بے داغ معصومیت، شریف النفسی، رضا جوئی، ان کی سوچتی ہوئی آنکھوں کا ملکوتی جذبہ ترحم اور ان کے چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش ان کی شخصیت کی عظمت آشکارا کرنے کے لئے کافی ہیں۔'' (۲)

اور یہی وہ خوبی ہے جس میں وہ یگانہ روزگار تھے۔

وہ علامہ شبلی کے شاگرد خاص اور عزیز تھے۔ ہم وطن اور برادری کے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے معاصر تھے۔ فارسی دانی میں سید صاحب پر تفوق حاصل تھا۔ شعر وادب میں بھی وہ بہت ممتاز تھے، اس کے باوجود وہ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۴۶ء تک سید صاحب کے اس طرح ماتحت رہے کہ کبھی شکوہ کا موقع نہیں دیا۔ دارالمصنّفین کے احاطہ میں عہدہ و مراتب اور مناصب کے مسائل اٹھے۔ چہ میگوئیاں ہوئیں مگر مولانا کبھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے، بس اپنے کاموں میں مصروف اور اپنے استاذ شبلی کے علمی منصوبوں کی تکمیل میں تن من سے لگے رہے اور کسی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ایک بار سید صاحب سفر پر تھے اور ماہنامہ معارف کی ادارت کی مولانا عبدالسلام ندوی کے ذمہ تھی۔ انہوں نے اور مضامین کے ساتھ دارالمصنّفین کے اس وقت کے نئے رفیق [حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ [۱۹۱۸-۲۰۰۶ء] کے ایک مضمون سرمد کو بھی شامل اشاعت کر لیا۔ سید صاحب جب سفر سے واپس آئے تو تربیت کے پیش نظر اسے روک دیا۔ خیال خاطر احباب کے لئے وہ اس کو شائع بھی کر سکتے تھے۔ اس سے یقیناً انہوں نے سبکی محسوس کی ہوگی، مگر لب پہ شکوہ تک نہ آیا۔ کمال ضبط کی ایسی مثالیں کہاں ملیں گی۔ حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم نے اپنی کتاب ''سرمد اور ان کی رباعیاں'' کے دیباچے میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے۔ اس سے جہاں سید صاحب کے معارف اور دارالمصنّفین کے معیار ووقار کے پاس ولحاظ کا پتہ چلتا ہے وہیں

مولانا عبدالسلام ندوی کی بے نفسی اوران کی طرح داری کے جلوے بھی سامنے آتے ہیں۔

دارالمصنّفین کا آغاز سیرۃ النبی اور سیر الصحابہ کی تدوین سے ہوا۔ اس کے بعد تابعین، تبع تابعین، تاریخ اسلام، ناموران اسلام، تاریخ وتذکرہ اور شعر وادب کے مختلف سلسلوں کو قائم کر کے رفقاء واہل قلم کے ذریعہ شبلی کے منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہونچانے کا کام بڑے پیمانہ پر ہوا اور یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔ دارالمصنّفین کی طویل تاریخ میں مولانا عبدالسلام ندویؒ ایک ایسے شخص کا نام ہے جن کے فیض تربیت اور علمی فیوض و برکات سے شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو فیضیاب اور متمتع نہ ہوا ہو، حتیٰ کہ خود مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی سیرۃ النبی کی تدوین وتالیف میں ان سے تعاون لیا، جس کا ذکر انہوں نے سیرت کے دیباچے میں کیا ہے۔ بعد کے رفقاء و مصنّفین دارالمصنّفین نے بھی اس آفتاب کمال سے فیض یاب ہونے کا ذکر کیا ہے، ان سب کے باوجود دارالمصنّفین کی نظامت، معارف کی ادارت وغیرہ کی خواہش ان کے حاشیہ خیال میں نہ آئی بلکہ ان کی زندگی ہی میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی دارالمصنّفین کے ناظم اور ماہنامہ معارف کے مدیر بنائے گئے اور مولانا عبدالسلام ندویؒ ان کے ماتحت ٹھہرے لیکن وہ کبیدہ خاطر بھی نہ ہوئے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ شاہ معین الدین احمد ندوی کا اسی طرح خیال کرتے رہے جس طرح ایک ماتحت کا ہوسکتا ہے۔

اسوۂ صحابہ، اسوہ صحابیات، اقبال کامل اور شعر الہند کی وجہ سے ان کا آفتاب شہرت نصف النہار پر تھا۔ بڑے بڑے اہل قلم اور مصنف ان سے ملنے کے لئے آتے اور ملاقات کرنا فخر خیال کرتے مگر مولانا کو ان سب باتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ عزت و شہرت، نام ونمود اور تعریف وتحسین کے معنی ومفہوم کو وہ ایک بے معنی سی بات سمجھتے تھے۔ ایسی سادگی اور بے نفسی کی مثالیں کہاں ملیں گی۔

مولانا ابوالکلام آزاد ان کے ہمدم دیرینہ تھے۔ دونوں میں بڑی قربت تھی۔ مولانا آزاد کی شخصیت اوران کے اثرات وتعلقات سے وہ حصول دنیا کی کوششیں کر سکتے تھے اور بہت کچھ دنیاوی عزتیں حاصل بھی کر سکتے تھے مگر اس کی بھی انہوں نے کوئی ادنیٰ کوشش نہیں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے احباب ومعاصرین میں کوئی بھی بے نیازی کی اس خوبی میں ان کا ہم سر نہ تھا۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے کہ:

''بڑے قانع و بے نیاز تھے۔ حصول دنیا کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی اور ایک قلیل معاوضہ پر پوری زندگی گذار دی۔ دارالمصنّفین میں تنہا وہی ایسے شخص تھے جس نے اس قلیل تنخواہ کے علاوہ جو ان کو ملتی تھی دارالمصنّفین کے اندر یا باہر کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ یہی حال شہرت سے بے نیازی کا تھا، اس سے وہ دور بھاگتے تھے، مصنّفین اور اہل قلم کے طبقہ میں ان جیسی بے نیازی کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ بے نیازی کی آخری حد یہ ہے کہ ان کو اپنے کمالات تک کا احساس نہ تھا اور وہ اپنے کارناموں تک کو بھی اہمیت نہ دیتے تھے، جن کی ایک دنیا معترف ہے۔ اس کا ذکر تک پسند نہ کرتے تھے۔ میں ان سے اکثر کہا کرتا تھا کہ تمام مصنّفین و اہل قلم کسی نہ کسی بہانے اپنے حالات اور کارنامے لکھ جاتے ہیں آپ بھی لکھوا دیجیے تا کہ آپ کے بعد ہم لوگوں کو اس کے لکھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ وہ ہمیشہ بڑی بے پروائی سے جواب دیتے میرے حالات ہی کیا ہیں اور مرنے کے بعد ان کے لکھنے سے کیا حاصل۔ .... سیاست اور ریا و نفاق کے نام سے ناآشنا تھے۔ ان کا ظاہر و باطن بالکل ایک تھا۔ جو دل میں تھا وہی زبان پر۔ ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جس کو ہر شخص پڑھ سکتا تھا۔''(۳)

اپنے دور شباب میں انہوں نے بڑی پرزور اور معرکہ آراء کتابیں لکھیں۔ آخر عمر میں اگر چہ قویٰ مضمحل ہو گئے تھے مگر ان کے قلم کی رعنائی میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ اسی طرح سبک خرام رہا۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی طاقت تھی کہ ان کی زندگی غیر معتدل رہتی اور قلم جادۂ اعتدال سے نہ ہٹتا اور وہ مہمات مسائل پر بے ساختہ لکھتے رہتے۔ تاریخ ہو یا تذکرہ، سیرت و سوانح ہو یا شعر و ادب ہر جگہ معلومات کا دریا بہا دیتے اور ادب و انشاء کے موتی پرو دیتے۔ دراصل وہ فضل و کمال کے اس مقام پر پہونچ گئے تھے جہاں امتیاز من و تو مٹ جاتا ہے۔

ان کی دو کتابیں ''دلائل الفرقان'' اور ''اعجاز القرآن'' ان کے ایک ہم عصر ادیب و انشا پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی [۱۸۹۲-۱۹۷۷ء] کے پاس دارالمصنّفین سے اس غرض سے بھیجی گئیں کہ اسے شائع کیا جائے یا نہیں۔ غالبًا انہوں نے نفی میں جواب دیا اور وہ کتابیں نہ اس وقت شائع ہوئیں اور نہ بعد میں بلکہ اب تک شائع نہ ہوسکیں تاہم مولانا عبدالسلام ندوی نے اس کا کہیں شکوہ نہیں کیا اور نہ چراغ پا ہوئے کہ ان کی کتاب کی اشاعت کا فیصلہ ان کا ایک ہم عصر کرے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی ان رفعتوں کو ان کی شخصیت کی بلندی، عالی ظرفی اور وسعت قلب و نظر کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔

آغاز دارالمصنّفین سے اب تک اس ادارہ سے متعدد اہل علم وقلم وابستہ رہے۔ ان میں نامور بھی ہیں اور بے نام بھی، علم وفضل کے پہاڑ بھی تھے اور جہان علم ودانش کے بحر ذخار بھی مگر شرافت، اخلاص، بےنفسی اور شان قلندری میں مولانا عبدالسلام ندوی کا کوئی مثیل تھا نہ بدیل۔ حق مغفرت کرے بڑی خوبیاں اس مرد قلندر کی ذات میں تھیں۔

حواشی

(۱) شبلی کالج میگزین [مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں] ص ۱۶-۱۷

(۲) ایضاً ص ۶۷

(۳) ایضاً ص ۱۶-۱۷

تصنیفات وتالیفات

علامہ شبلی نعمانی نے نامورانِ علم وفن کا جو کارواں اپنے پیچھے چھوڑا تھا مولانا عبدالسلام ندوی اس کے رکن اعظم تھے۔ مدۃ العمر تحقیق و تدقیق اور تصنیف وتالیف میں مصروف رہے اور متعدد گراں مایہ کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ ان کا شمار ملک کے صف اول کے مصنّفین میں ہوتا ہے۔ مولانا سعید انصاری نے ان کی اولیات کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ پہلے ایسے شخص تھے جنہوں نے تصنیف وتالیف کا فن باقاعدہ سیکھا۔ (۱) اس فن پر ان کی کس قدر گہری نگاہ تھی اس کا اندازہ ان کے درج ذیل خیالات سے لگایا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''تصنیف وتالیف کا میدان ایک ایسا میدان ہے جس کی تنگی اور وسعت دونوں ایک تصنیف کے لئے مشکلات کا سبب بن جاتی ہیں۔ اگر یہ میدان تنگ اور محدود ہے تو اس کے لئے یہ مشکل پیش آتی ہے کہ تھوڑی سی معلومات سے کیوں کر اس طرح کام لے کہ وہ پھیل کر ایک مستقل تصنیف کا قالب اختیار کرلیں، اس لئے وہ اس مشکل کے حل کرنے کے لئے بعض اوقات نہایت تصنع وتکلف سے کام لیتا ہے اور بہت سی غیر ضروری اور غیر متعلق باتوں کو شامل کرکے کتاب کے حجم وضخامت کو بڑھاتا ہے۔ اس طریقے سے اگرچہ ایک کتاب تو تیار ہوجاتی ہے، لیکن اس کو اصل موضوع کتاب سے کوئی تعلق نہیں رہتا لیکن اگر یہ میدان وسیع اور غیر محدود ہوتا ہے تو اس کو یہ دشواری پیش آتی ہے کہ وہ ان غیر محدود اور وسیع معلومات کو سمیٹ کر کیوں کر متوسط حجم اور ضخامت کی ایک خوب صورت کتاب مرتب کرسکتا ہے۔ معلومات کا ایک بے پایاں ذخیرہ اس کی

نگاہ کے سامنے ہوتا ہے اور اس میں سے اس کو اپنے ذوق سلیم کی مدد سے
مفید اور ضروری معلومات کا انتخاب کر کے اپنی راہ سب سے الگ نکالنی
پڑتی ہے۔''(۲)

اس پختہ تصنیفی شعور کے ساتھ انہوں نے متنوع موضوعات پر کتابیں لکھیں جنہیں بے حد سراہا گیا۔ان کی گراں مایہ تصنیفات دراصل ہمارے ذخیرہ علم وادب میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ذیل میں ان کی تصنیفات کا تعارف پیش کیا جاتا ہے:

ا۔ابن یمین

ابن یمین فارسی کا مشہور شاعر گذرا ہے لیکن اس کے حالات علی العموم دستیاب نہ تھے۔یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی نے شعر العجم میں اس کا اجمالاً ذکر کیا۔مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ:

'' شعرائے ایران میں سعدی اور ابن یمین نے اخلاقی شاعری میں
خصوصیت کے ساتھ ناموری حاصل کی اور فارسی شاعری میں اخلاق کا جو
ذخیرہ موجود ہے وہ زیادہ تر انہی دونوں بزرگوں کا جمع کیا ہوا ہے۔لیکن
بایں ہمہ ابن یمین تاریخی حیثیت سے سعدی کی طرح خوش قسمت نہیں
.............اس قدر بدقسمت ہے کہ اس کے متعلق اردو زبان میں ایک
مختصر سا رسالہ بھی نہیں مل سکتا۔تقریباً فارسی بلکہ یورپین زبانوں کا بھی یہی
حال ہے۔(۳)

اسی احساس کے پیش نظر انہوں نے یہ کتاب ترتیب دی۔اس میں ابن یمین کے حالات وسوانح اور ان کے کلام پر نقد وتبصرہ کیا گیا ہے۔اس کے اخلاق و مذہب پر بھی مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ایران جدید کے معروف ادیب وشاعر رشید یاسمی کا فارسی رسالہ اس کا بنیادی ماخذ ہے۔اسی کو دیکھ کر مولانا کے دل میں ابن یمین کے حالات وسوانح اردو میں لکھنے کا خیال آیا۔ چنانچہ انہوں نے رشید یاسمی کے رسالہ میں قدرے ترمیم وتنسیخ اور حذف واضافہ کر کے اسے ایک

نئے قالب میں پیش کیا ہے۔۲۲۵صفحات کی اس کتاب کوصوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پنڈی بہاءالدین پنجاب نے ۱۹۲۱ء میں شائع کیا۔بابائے اردو مولوی عبدالحق[۱۸۷۰-۱۹۶۱ء] نے اس پراچھا تبصرہ کیا ہے۔(۴)

۲۔اسوۂ صحابہؓ

سیرت نبویؐ کے ساتھ سیر الصحابہؓ کا خیال بھی علامہ شبلی کے ذہن میں آیا تھا اور وہ اس کی تدوین وتکمیل کی فکر بھی رکھتے تھے۔چنانچہ ایک دفعہ ان کے حبیب خاص مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی[۱۸۸۶-۱۹۵۰ء] نے یہ کام کرنا چاہا توان کولکھا کہ:

> ''واللہ میرے دل کی بات چھین لی۔صحابہؓ کے حالات سے بڑھ کرکوئی چیز ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتی لیکن ہر پہلوکو لیجئے اوران پہلوؤں کوصاف دکھایئے جن سے آج کل کے مولوی قصداً چشم پوشی کرتے ہیں۔مفصلہ ذیل کتابیں اس کے لئے ضروری ہیں،استیعاب قاضی عبدالبر،اسدالغابہ، اصابہ،ابن کثیر شامی۔''(۵)

سیرت نبوی کے مصارف کی طرف سے والی بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم [۱۸۵۸-۱۹۰۳ء] نے انہیں ابھی پوری طرح مطمئن نہیں کیا تھا،اس وقت منشی محمد امین زبیری [۱۸۷۰-۱۹۵۸ء]مہتمم تاریخ بھوپال کوخط لکھ کراس کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی:

> ''سیرت کی رقم بھی مستقل ہو جاتی تو بہت اچھا تھا۔اسی مد کی تصنیف کا مستقل سلسلہ قائم رہتا۔کانوں میں بھنک توڈال دیجئے۔وسیع سلسلہ ہے مثلاً سیرۃ الصحابہ،سیرۃ ازواج پیغمبرعلیہ السلام وغیرہ وغیرہ''(۶)

یہ واقعہ ہے کہ اسوۂ نبویؐ کے بعدمسلمانوں کے لئے نمونہ عمل صحابہ کرامؓ کا اسوہ ہی ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی کی وفات کے بعد دارالمصنّفین نے جب با قاعدہ علمی کاموں کا آغاز کیا تو سیرت نبوی کے ساتھ سیر الصحابہ کا بھی آغاز ہوا۔سیرت نبوی کی تمام تر ذمہ داری مولانا سید سلیمان ندوی نے اٹھائی تو سیر الصحابہ کے سلسلہ کومولانا عبدالسلام ندوی نے اپنے ہاتھوں میں لیااور تین جلدوں

میں اسوۂ صحابہؓ وصحابیات لکھی اور یہ واقعہ ہے کہ سیرت نبوی کے بعد دارالمصنّفین کی مقبول ترین کتاب اسوۂ صحابہؓ ہی ہے۔

پہلے حصہ میں عقائد ،عبادات ،معاملات ،فضائل اخلاق ،حسن معاشرت ،حسن معاملت،طرز معاشرت وغیرہ کے متعلق صحابہ کرامؓ کے موثر، سبق آموز اور نہایت قیمتی اور مستند واقعات لکھے گئے ہیں۔مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> ''انبیاء،صوفیا اور پیشوایان مذہب کے متعلق جو مبالغہ آمیز اور موضوع روایتیں پیدا ہوجاتی ہیں،وہ قدرتی طور پر صحابہ کرامؓ کے متعلق بھی پیدا ہوئیں اور شدت کے ساتھ اسلامی لٹریچر میں سرایت کرگئیں کہ عام طور پر فضائل ومناقب کے لفظ سے اسی قسم کی روایتوں کی طرف ذہن متبادر ہوتا ہے،لیکن اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس قسم کے دور از کار روایات کو بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے۔''(۷)

یہ اس قدر عمدہ اور موثر کتاب ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والا شخص بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔صحابہ کرامؓ کی پردہ پوشی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

> ''ایک شخص ایک بار گناہ کا مرتکب ہوتا ہے ہم لوگ اس کو افسانہ بزم و انجمن بنالیتے ہیں لیکن صحابہ کرامؓ لوگوں کی برائی کو چھپاتے تھے اور نیکیوں کو نمایاں کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں دنیا کے سیاہ چہرے پر عیب پوشی کی نورانی چادر پڑی ہوئی تھی۔''(۸)

اسوہ صحابہ پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے ماہنامہ معارف میں [باب التقریظ والانتقاد کے تحت] بڑا خوب صورت تبصرہ کیا ہے۔اسے دارالمصنّفین نے ۱۹۲۰ء میں پہلی بار شائع کیا۔اس وقت سے مسلسل شائع ہورہی ہے اور کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۲۲ء میں اس کا دوسرا حصہ شائع ہوا۔اس میں صحابہ کرامؓ کے مذہبی سیاسی،علمی اور عملی کارناموں کی تفصیل ہے۔نیز صحابہ کرامؓ نے کس طرح عادلانہ نظام حکومت قائم کیا اور کس طرح مذہب،اخلاق اور علوم وفنون اسلامیہ کی حفاظت واشاعت کا بڑا کارنامہ انجام دیا،اس کی بھی تمام

تفصیلات قدیم مستند مآخذ سے انتہائی ہنرمندی کے ساتھ قلم بند کی گئی ہیں جس سے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر اردو اور فارسی کیا عربی میں بھی بے مثال ہے۔ خود مصنف نے بھی اس کی یکتائی کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''کتاب کی ترتیب میں جو کدو کاوش کی گئی ہے، صحت کا جو التزام کیا گیا ہے، فضائل اخلاق کے جو عنوانات قائم کئے گئے ہیں، صحابہ کرامؓ کی زندگی کے ایک ایک خط و خال کو جس طرح نمایاں کیا گیا ہے، اس کے لحظ سے یہ دعویٰ بیجا نہ ہوگا کہ اس موضوع پر آج تک ایسی جامع کتاب اردو، فارسی کیا عربی میں بھی نہیں لکھی گئی۔''(۹)

یہ کتاب مذہبی بھی ہے اور تاریخی بھی۔ اس سے خاص طور سے عہد صحابہؓ کی اخلاقی، معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ ایک اور معنی میں یہ ادبی کتاب بھی ہے۔ اس میں ادب و انشا کے بڑے دلآویز مرقعے ہیں۔ اس کی نثر کی روانی، رعنائی اور لطافت ملاحظہ ہو۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''دریائے حق کے جزر و مد کا یہ کتنا عجیب و غریب منظر ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام مدتوں توحید کا غلغلہ بلند کرتے رہے لیکن ان کے سائے کے سوا کسی نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انصار و اعوان کی جستجو میں من انصاری الی اللہ کا نعرہ لگایا لیکن چند حوارین کے سوا کسی نے ان کی حمایت نہ کی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو چھوڑا تو آفتاب عالم کے نور سے ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ روشن تھا۔''(۱۰)

حصہ دوم کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے بھی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسوہ صحابہ مولانا کی علمی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

۳۔ اسوۂ صحابیاتؓ

اسوہ صحابہ کے بعد مولانا نے خواتین کی اصلاح و تربیت کے لئے صحابیات کی زندگی

کے علمی و عملی نقوش پیش کئے تا کہ وہ اس کی روشنی میں اپنی زندگیاں سنوار سکیں۔اسی غرض سے انہوں نے اسوہ صحابیاتؓ کی داغ بیل ڈالی۔وہ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''عورتوں کی تعلیم وتربیت کے مسئلہ سے اصولاً کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ گفتگو جو کچھ ہے موجودہ تعلیم وتربیت سے متمتع ہو کر ایک مسلمان عورت، مذہب، اخلاق اور معاشرت کے قدیم اصول کو قائم رکھ سکے گی یا نہیں۔ دوسرے الفاظ میں قدیم اسلامی روایات کا تحفظ کر سکے گی یا نہیں۔جن لوگوں کو مسئلہ تعلیم نسواں سے اختلاف ہے وہ اسی شبہ کو اپنی دلیل قرار دیتے ہیں اور موجودہ دور کے تعلیم یافتہ مردوں نے جو مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی نمونے قائم کئے ہیں ان سے بھی اس شبہ کی تائید ہوتی ہے اور غیر قوموں کی تعلیم یافتہ عورتوں نے بھی ہماری خواتین کے لئے کوئی عمدہ نمونہ قائم نہیں کیا ہے لیکن اسلام کی قدیم تاریخ ہمارے سامنے مسلمان عورت کا بہترین اور اصلی نمونہ پیش کرتی ہے اور آج جب کہ زمانہ بدل رہا ہے، یورپین تمدن اور یورپین طرز معاشرت سے ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگ بھی بیزاری ظاہر کر رہے ہیں، اگر ہماری عورتوں کے سامنے اسلام کی ممتاز اور برگزیدہ خواتین کا نمونہ پیش کر دیا جائے تو ان کی فطری لچک اس سے اور بھی زیادہ متاثر ہو سکے گی اور وہ موجودہ دور کے موثرات سے بیزار ہو کر خالص اسلامی اخلاق، اسلامی معاشرت اور اسلامی تمدن کا نمونہ بن جائیں گی۔''(۱۱)

چنانچہ انہوں نے ازواج مطہرات، بنات طیبات اور اکابر صحابیات کی زندگی کے دینی واخلاقی اور معاشرتی حالات نیز ان کے عقائد، عبادات، معاملات، فضائل اخلاق ایثار، فیاضی وفراخدلی، حسن معاشرت وغیرہ کے واقعات نہایت موثر اور سبق آموز انداز میں جمع کر دئے ہیں اور ان کی مذہبی، علمی اور اخلاقی خدمت کی تاریخ بھی پیش کر دی ہے، جس سے عہد رسالت کی خواتین کے اخلاق ومعاشرت اور طرز زندگی کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے۔

فنی لحاظ سے یہ کتاب تہذیبی وتمدنی تاریخ کا حصہ ہے۔اردو زبان میں یہ پہلی کتاب تھی جس میں خواتین کی طرز معاشرت اور معاملات زندگی کی مرقع آرائی کی گئی۔مولانا عبدالسلام ندوی نے اس کا سبب تالیف خواتین کی اصلاح وتربیت بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''ہماری عورتوں اور لڑکیوں کے درس وہدایت اور مطالعے کے لئے مستند اور موثر واقعات کا ایک مجموعہ مرتب ہوجائے جس پر عمل کر کے وہ خالص اسلامی تعلیمات کا نمونہ بن جائیں گی اور ان کی تعلیم وتربیت کے متعلق جوشبہات ظاہر کئے جارہے ہیں ان کی عملی تردید کرسکیں گی۔(۱۲) یقیناً اس سے یہ فائدہ آج بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔یہ کتاب خواتین کے لئے زادِراہ اور تحفۂ ہدایت ہے۔اسے دارالمصنّفین نے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔اس کے ابتک دسیوں ایڈیشن ملک وبیرون ملک سے طبع ہوچکے ہیں۔

۴۔اقبال کامل

دارالمصنّفین سے علامہ اقبال[۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] کے بڑے قریبی روابط تھے۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد دارالمصنّفین کے ارباب حل وعقد نے ان کے سوانح حیات اور ان کے شاعرانہ کارناموں کو قلم بند کرنے کا منصوبہ بنایا اور یہ کام مولانا عبدالسلام ندوی کے سپرد کیا کہ دارالمصنّفین میں شعروادب کے وہ سب سے بڑے اداشناس تھے۔چنانچہ مولانا نے علامہ اقبال کے کلام اور ان پر شائع شدہ مضامین ومقالات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اسے مزید جامع ومانع بنانے کے لئے اہل علم خاص طور سے مولانا عبدالماجد دریابادی اور ڈاکٹر سید عبداللہ[۱۹۰۴-۱۹۸۶ء] وغیرہ سے خط وکتابت کی (۱۳) اور تقریباً چار برس کی جاں کاہ محنت کے بعد یہ کتاب سپرد قلم کی۔اس میں علامہ اقبال کے حالات وسوانح، اخلاق وعادات اور ان کی تصنیفات اور مجموعہ کلام پر نقد وتبصرہ کیا گیا ہے اور ان کے ان علمی کارناموں کا ذکر بھی ہے جسے وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔اس کے بعد ان کی شاعرانہ عظمت اور بلند پایگی کی سرگذشت ہے جس کے مختلف ادوار قائم کر کے ہر دور کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔اردو کے ساتھ ان کے فارسی کلام پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے اور کلام اقبال کے محاسن ونقائص دونوں دکھائے گئے ہیں۔علامہ اقبال کی شہرت ومقبولیت اور اس کے اسباب اور ان کے کلام کے تراجم کا بھی تفصیلی ذکر ہے۔فلسفہ خودی

اوراس کے اجزاء وعناصر بھی بیان کئے گئے ہیں۔ نیز فلسفہ بے خودی کا بھی ذکر ہے۔ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ سے متعلق نظریات اقبال کا تنقیدی تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔آخر میں نعتیہ کلام پر نقد وتبصرہ ہے۔مولانا عبدالسلام ندوی نے اس میں اقبال کے لفظی ومعنوی اغلاط کی بھی نشاندہی کی ہے۔اس طرح یہ کتاب علامہ اقبال کی عظیم شخصیت اور شاعرانہ فضل وکمال پر ایک جامع اور مبسوط تصنیف قرار پاتی ہے۔اقبال پر جو چند اہم کتابیں مرجع تسلیم کی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم [۱۸۹۳-۱۹۵۹ء] لکھتے ہیں:

> ''اقبال پر درجنوں کتابیں اور ہزاروں مضامین لکھے گئے ہیں اور بے شمار تقریریں اس پر ہو چکی ہیں لیکن یہ سلسلہ نہ ختم ہوا ہے نہ ہوگا۔اقبال پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں محققانہ تصانیف بہت کم ہیں۔میرے نزدیک اقبال پر دو کتابیں نہایت بلیغ اور نہایت جامع ہیں۔ڈاکٹر یوسف حسین خان کی ''روح اقبال'' اور مولانا عبدالسلام ندوی کی ''اقبال کامل'' ان دونوں کتابوں کو ملا کر پڑھیں تو اقبال کے کلام اور ان کی تعلیم کا کوئی پہلو ایسا نہیں دکھائی دیتا جو محتاج تشریح اور تشنہ تنقید باقی رہ گیا ہو۔'' (۱۴)

اقبال کامل سے پہلے اقبالیات کا جو سرمایہ تھا مولانا کو اس پر اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس میں انہوں نے بڑی کدوکاوش سے کام لیا جس کا ذکر انہوں نے اس طرح کیا ہے:

> ''ڈاکٹر صاحب کی شاعری اور فلسفہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر مجھ کو بہت کچھ اضافہ کی ضرورت معلوم ہوئی اور اس کتاب میں میں نے جو کچھ دماغی کاوش کی ہے وہ صرف اسی حصے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے جس کے لئے صرف اخذ وانتخاب کافی نہیں تھا بلکہ ڈاکٹر صاحب کے پورے کلام کے مطالعے کی ضرورت تھی۔ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ زیادہ فلسفیانہ، صوفیانہ مذہبی، سیاسی اور قومی مسائل پر مشتمل ہے، لیکن یہ مسائل شاعرانہ طرز واسلوب میں بیان کئے گئے ہیں، اس لئے کہ ان کی تمام حیثیتوں پر شاعرانہ حیثیت کو تقدم حاصل ہے اور ہم کو اس موقع پر اسی حیثیت کو پیش

نظر رکھنا چاہئے لیکن ڈاکٹر صاحب پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ان کی شاعرانہ حیثیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور انہوں نے جن شاعرانہ حقائق ومسائل کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں، ان کی توضیح کے لئے جو مثالیں ان کے کلام سے پیش کی گئی ہیں، ان میں شاعری بہت کم پائی جاتی ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب شاعری سے برأت ظاہر کرتے ہیں اور غزل گو شاعر بننے سے تو ان کو شدت سے انکار ہے، اس لئے دوسرے لوگوں نے بھی ان کی مجددانہ، مصلحانہ اور فلسفیانہ حیثیت کو تو سامنے رکھا ہے اور ان کی شاعرانہ حیثیت کو نمایاں کیا ہے، لیکن میرے نزدیک ان کا کلام خشک فلسفیانہ مسائل کا مجموعہ ہے۔ یعنی وہ صرف ناظم نہیں ہیں بلکہ ایک قادرالکلام شاعر ہیں، اس لئے میں نے فلسفیانہ، صوفیانہ اور سیاسی مسائل سے پہلے ان کی ذات کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے پیش نظر رکھا ہے اور مختلف عنوانات میں ان کی شاعرانہ حیثیت کو زیادہ مکمل صورت میں نمایاں کیا ہے۔ فلسفیانہ اور صوفیانہ حقائق ومسائل پر بھی جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی اسی حیثیت کو سامنے رکھا اور زیادہ تر ان کی غزلیات، قطعات اور نظموں سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن میں شاعری اور فلسفہ دونوں کا خوش گوار امتزاج موجود ہے۔" (۱۵)

یہاں ایک دو اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے کہ اقبال کے مطالعہ میں مولانا عبدالسلام ندوی کا اسلوب کیا ہے اور کس نوع سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ وہ خودی کی تعریف وتشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خودی سے فخر وغرور مراد نہیں بلکہ اس سے استقلال ذاتی مراد ہے جو ہر مخلوق کے علم وعمل کو ایک مخصوص دائرے میں نمایاں کرتا ہے۔ اس کی ذات وصفات کی بود ونمود کے مظاہر متعین کرتا ہے اور اس کے نشو نما اور بالیدگی کے سامان فراہم کرتا ہے۔ اس لئے وہ جوہر ہے عرض نہیں۔

آفتاب ہے آفتاب کا سایہ نہیں۔ متحرک ہے ساکن نہیں۔غرض وہ حقیقی زندگی ہے اور زندگی کی تمام لذتیں اس کے استحکام، اس کی توسیع اور اس کے اثبات سے وابستہ ہیں۔''(۱۶)

پھر اقبال کے فلسفہ خودی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کے فلسفہ خودی کے تمام اساسی مضامین درحقیقت قرآن مجید سے ماخوذ ہیں اور قرآن مجید میں فضیلت انسان، تسخیر فطرت، عزم واستقلال، جرأت وشجاعت، فتح ونصرت، حمیت وغیرت اور قدرت واختیار پر بکثرت آیتیں موجود ہیں اور انہیں آیتوں نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو خودی یعنی جلال و جمال دونوں کا بہترین مجموعہ بنادیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ تمام مضامین قرآن مجید ہی سے لئے ہیں۔''(۱۷)

اقبال کامل سے پہلے اقبال پر جو کچھ لکھا گیا تھا اس میں ان کے کلام پر تنقید نہیں محض تحسین ہی تحسین تھی۔ اس لئے انہوں نے لکھا کہ

''چوں کہ کسی نے ان کی غلطیوں اور خامیوں کو تفصیل سے نہیں دکھایا ہے، اس لئے ہم خود اس ناگوار فرض کو ادا کرتے ہیں۔''(۱۸)

چنانچہ مولانا نے کلام اقبال میں تذکیر وتانیث، محاوروں وغیرہ کے غلط استعمال کی نشاندہی بھی کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے فلسفہ شاعری اور فلسفیانہ افکار کی توضیح وتفہیم میں مولانا عبدالسلام ندوی نے یہی انداز اختیار کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کامل حیات اقبال کے ساتھ فکر اقبال کی تفہیم کا خوب صورت ذریعہ بنی اور بلاشبہ مصنف نے اس میں بڑی دیدہ ریزی اور کدوکاوش سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کامل ذخیرہ اقبالیات میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہو کر اقبال کے شیدائیوں اور نقادوں سے حسن قبول کی سند پا چکے ہیں۔

۵۔ القضافی الاسلام

یہ دراصل وہ مقالہ ہے جو مولانا عبدالسلام ندوی نے اورینٹل کانفرنس الہ آباد کے

جلسے [منعقدہ نومبر ۱۹۲۶ء] میں پیش کیا تھا جو بعد میں ماہنامہ معارف [نومبر دسمبر ۱۹۲۷ء، جنوری ۱۹۲۸ء] میں قسط وار شایع ہوا۔اس میں شہادت اور فصل مقدمات کے اسلامی اصول وقوانین کی توضیح وتشریح کی گئی ہے۔نیز ضمناً قضا اور متعلقات قضا وغیرہ کی بھی تفصیلات قلم بند کی گئی ہیں۔ اپنے موضوع پر یہ نہایت بصیرت افروز کتاب ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

> ''مولانا نے یہ مضمون ۱۹۲۶ء کے نومبر میں اورینٹل کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں پڑھا تھا اور نئے موضوع ہونے اور مصنف کی تلاش ومحنت کے سبب سے خاص طور سے پسند کیا گیا تھا۔اس موضوع پر اب تک اردو میں کوئی چیز نہیں لکھی گئی۔اکثر وہ اشخاص جو اسلامی قانون سے دلچسپی رکھتے ہیں اس قسم کے معلومات کے خواہش مند رہتے ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس کو معارف میں بھی شائع کیا جائے اور علاحدہ رسالہ کی صورت میں بھی چھاپا جائے۔''(۱۹)

اس کا انداز نگارش ملاحظہ ہو:

> ''اگر کوئی شخص دولت مند ہونے کے بعد دیوالیہ ہوجانے کا دعویٰ کرے تو اس کے اثبات دعویٰ کے لئے کم از کم تین گواہ پیش کرنے ہوں گے۔ کیوں کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث موجود ہے کہ جس شخص کے افلاس کے متعلق خود اس کی قوم کے تین باہوش شخص شہادت دیں تو اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے لیکن ان صورتوں کے علاوہ قاضی صرف ایک گواہ کی شہادت سے بھی فیصلہ کرسکتا ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نظیر قائم کردی ہے۔چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعی سے حلف لے کر ایک گواہ کی شہادت سے فیصلہ کیا۔''(۲۰)

۹۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۲۹ء میں دارالمصنّفین نے شائع کی تھی۔اب یہ عرصہ سے دستیاب نہیں۔اس کے طبع جدید کی ضرورت ہے۔

۶۔امام رازی

امام فخر الدین [محمد بن عمر بن حسین] رازی کو ان کی عظمت و بلند پایگی اور جامعیت کی وجہ سے بڑا اہم مقام حاصل ہے۔امام غزالی کے بعد مسلمان فلاسفہ اور متکلمین میں وہ اس لحاظ سے سب سے زیادہ ممتاز اور یکتا ہیں کہ انہوں نے فلسفہ اور علم کلام کے مسائل پر تنقیدی زاویہ سے بحث و تحقیق کی اور ان کو سلیقے سے پیش کیا،اس لئے ضرورت تھی کہ ان کے حالات اور کارناموں کو تفصیل سے قلم بند کیا جائے ،چنانچہ مولانا عبدالسلام ندوی نے اس خلاء کو پر کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی۔

اس میں امام رازی کے حالات وسوانح ،اخلاق و عادات ،اولاد واحفاد ، شاعری وغیرہ کا تذکرہ ہے۔اس کے بعد ان کی تصنیفات کا تعارف اور ان پر نقد وتبصرہ کیا گیا ہے۔آخر میں ان کے فلسفہ وکلام اور اس کے اصول ونظریات کی توضیح وتشریح بھی کی گئی ہے۔اس میں اثبات باری تعالیٰ،توحید،مسئلہ خیروشر،رویت باری ،جبروقدر،نبوت، معاد وغیرہ موضوعات پر افکار رازی کا تجزیہ ہے۔آخر میں ان کی تفسیر اور اس کی متعدد خصوصیات اور بعض دوسرے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

امام رازی نے مختلف علوم وفنون میں اسی [۸۰] کتابیں قلم بند کیں،ان کا تعارف و تجزیہ بھی کتاب میں شامل ہے۔لیکن ان کا اصل میدان فلسفہ وکلام تھا۔چنانچہ مولانا عبدالسلام ندوی نے ان پر خاص طور سے نقد وتبصرہ کر کے فلسفہ وکلام کے بارے میں ان کے نظریات سے مفصل بحث کی ہے اور یہی حصہ دراصل مصنف کی محنت کا ماحصل ہے۔یہ سوانح عمری علامہ شبلی کی الغزالی کے انداز پر لکھی گئی ہے۔اس کا مقصد تالیف سوانح عمری لکھنا نہیں بلکہ اس کے پس پشت صاحب سوانح کی تصانیف اور ان کے فلسفہ وعلم کلام پر نقد وجرح کرنا اور ان کی افادیت واضح کرنا مقصود ہے۔مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> ”جس طرح مولانا شبلی مرحوم نے الغزالی میں فلسفہ وکلام کے متعلق امام غزالی کے خیالات ونظریات کی تشریح کی ہے اسی طرح امام رازی کے

خیالات ونظریات کی تشریح کی بھی ضرورت تھی اور یہ کتاب اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔''(۲۱)

۳۹۰ رصفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں دارالمصنّفین سے شائع ہوئی۔

۷۔تاریخ اخلاق اسلامی:

مولانا عبدالسلام ندوی کو اپنے استاذ علامہ شبلی کی طرح سیاسی تاریخ کے بالمقابل تہذیبی وتمدنی تاریخ سے خصوصی لگاؤ تھا۔ چنانچہ ان کی تصنیفات اور مضامین کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے سیاسی تاریخ سے مطلق تعرض نہیں کیا لیکن تہذیبی وتمدنی تاریخ پر متعدد کتب ومقالات یادگار چھوڑے ہیں۔

مشہور مورخ ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی[۱۸۳۸-۱۹۰۳ء] کی کتاب تاریخ اخلاق یورپ کو دیکھ کر مولانا عبدالسلام ندوی کے دل میں اسی طرز اور اسی اسلوب پر تاریخ اخلاق اسلامی کی تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ یہ کام اس لحاظ سے بڑا اہم تھا کہ اس موضوع پر سوائے لیکی کے اس وقت تک کسی اور زبان میں سرے سے کوئی تحقیقی کام ہی نہیں ہوا تھا۔اس لحاظ سے تاریخ اخلاق اسلامی مولانا عبدالسلام ندوی کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔اخلاق اسلامی کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ:

''اقوام وملل کی تاریخ جن اجزاء وعناصر کی ترکیب سے وجود میں آئی ہے ان میں اخلاق کو خاص اہمیت حاصل ہے اوراسلام نے بھی اس کو خاص اہمیت دی ہے،لیکن ان اخلاقی عناصر کا سراغ لگانا،ان میں ایک خاص تاریخی نظم وترتیب پیدا کرنا اور ہر دور میں ان کے تغیرات وانقلابات کو دکھانا سخت مشکل کام ہے۔''

چنانچہ مولانا نے یہ مشکل کام انجام دیا۔تاریخ اخلاق اسلامی دوحصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں نبوت سے پہلے کے عربوں کے اخلاق وعادات کی مرقع آرائی کی گئی ہے۔ پھر اس میں اسلام نے جو تغیر وانقلاب پیدا کیا اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بعدازاں عہد رسالت میں جس

طرح اخلاق وکردار کی تعمیر وتشکیل عمل میں آئی اس کی مفصل تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔

اس کی دوسری جلد شائع نہ ہوسکی، حالانکہ وہ تیار ہوگئی تھی۔اس کا ذکر مولانا عبدالسلام ندوی نے ایک خط میں کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''اس کا دوسرا حصہ بھی تیار ہوگیاہے اورسردست اس پرنظرثانی کررہا ہوں۔اس دوسرے حصے کےمباحث یہ ہیں:

وفات نبوی کے بعد اخلاقی تغیرات جومسلمانوں میں دورصدیقی، دور فاروقی، دورعثمانی، دورعلوی، دورخلافت بنی امیہ، دورعباسیہ میں ہوئے، مع علل و اسباب، امراء وسلاطین، علماء وصوفیا،حکماء وشعراء اورعام مسلمانوں کےاخلاقی محاسن ومعائب تنقیدی طورپر۔''(۲۲)

یہ کتاب کیوں کرشائع نہیں ہوئی اس کے اسباب کا کہیں ذکرنہیں ملتا البتہ مذکورہ خط میں یہ ذکر ہے کہ اس کتاب میں مسلمانوں کےاخلاقی محاسن کے ساتھ ان کے معائب کا بھی ذکر ہے اور یہ ایک تنقیدی تاریخ ہے اور''مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ مسلمان، مسلمانوں بالخصوص علماء وصوفیاء کے اخلاقی معائب سننا پسند نہ کریں گے۔''(۲۳) غالبًا مولانا عبدالسلام ندوی کی یہی بے باکی کتاب کی عدم اشاعت کا سبب بنی۔مولانا عبدالسلام ندوی اپنی تنقیدات کو نظرانداز کرنے کوبھی تیارنہ تھےاوراسےایک تاریخی خیانت تصورکرتے تھے۔

دوسرے حصے کی تکمیل کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی کے ذہن میں اخلاق اسلامی کے اوربھی سلسلے ذہن میں آئے۔مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''اس حصے [دوم] کی تکمیل کے بعد اوربھی اخلاقی عنوانات ذہن میں آئے۔مثلاً مساجدکا بالخصوص خانہ کعبہ کے تقدس کا، مدارس اسلامیہ کا، صوفیاء کی خانقاہوں کا،مختلف علوم وفنون مثلاً فقہ، حدیث،علم کلام،فلسفہ ومنطق،شعروشاعری وغیرہ کااثرمسلمانوں کےاخلاق پرکیاپڑا؟ حج کے موقع پرمسلمان جوخیرخیرات کرتے ہیں اس کا طریقہ مذہبی اوراخلاقی اصول کے مطابق صحیح ہے کہ نہیں؟ اور اس کااہل مکہ اوراہل مدینہ کے

اخلاف پر کیا اثر پڑا؟ شافعیہ، مالکیہ، حنبلیہ، اہل حدیث، اہل کلام وغیرہ کی اخلاقی حالت مختلف ہے یا یکساں۔ اگر مختلف ہے تو اس کے کیا اسباب ہیں؟ کیا خود ان کی فقہ کا اختلاف اس کا سبب ہے؟ ابھی تک ان سوالات کے متعلق تسکین بخش معلومات حاصل نہ ہوسکیں، کیا کتب خانہ حبیب گنج اس میں کچھ مدد دے سکتا ہے۔'' (۲۴)

انتقال سے چند ماہ پہلے انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ایک خط میں ''تاریخ اخلاق اسلامی'' حصہ دوم پر نظر ثانی کا ذکر کیا ہے۔ شاید حالات سے مجبور ہوکر اور اشاعت کی غرض سے انہوں نے ان مباحث کو نکالنے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر وہ نظر ثانی سے پہلے ہی رب حقیقی کے حضور جا ملے اور کتاب اب تک شائع نہ ہوسکی۔ اس کا مسودہ کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہے۔

۸۔ تاریخ التنقید

مولانا عبدالسلام ندوی فن تنقید کی مفصل تاریخ لکھنا چاہتے تھے اور اس کا آغاز بھی کر دیا گیا مگر افسوس کہ وہ اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ اس کا مسودہ میری نظر سے نہیں گذرا ہے۔ مولانا سعید انصاری نے لکھا ہے کہ یہ کتاب مسودہ کی شکل میں ہے اور آئندہ چھپے گی۔ (۲۵) جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے بھی اپنے مضمون میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (۲۶)

اردو شاعری اور فن تنقید کے عنوان سے کئی قسطوں میں مولانا کا جو مضمون ماہنامہ معارف میں شائع ہوا ہے وہ اصلاً تاریخ التنقید ہی کا حصہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی قدیم تنقید پر گہری نگاہ تھی اور اس کے عہد بہ عہد تاریخ سے وہ بخوبی واقف تھے۔ ضرورت ہے کہ اس کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ حصوں کو یکجا مرتب کر کے شائع کیا جائے۔

۹۔ حکمائے اسلام

یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں فلسفہ یونان کی تاریخ اور اس کے مآخذ، فلسفہ اشراق اور علوم عقلیہ کی مسلمانوں میں اشاعت کی مختصر تاریخ ہے، جس میں اس کے

قدیم مراکز کا مفصل تذکرہ ہے۔ پھر یعقوب کندی سے راغب اصفہانی تک کے کل ۲۴؍اکابر حکمائے اسلام کے حالات زندگی اور ان کی علمی خدمات، فلسفیانہ ومتکلمانہ افکار ونظریات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جس سے فلسفہ اسلام کے ساتھ فلسفہ یونان کی تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے۔

اس میں مندرجہ ذیل حکماء کا ذکر ہے:

۱۔ یعقوب کندی
۲۔ حکیم یحییٰ بن ابی منصور
۳۔ عباس بن سعید جوہری
۴۔ ابوالطیب سند بن علی
۵۔ بنو موسیٰ بن شاکر
۶۔ محمد، احمد
۷۔ حسن
۸۔ محمد بن موسیٰ خوارزمی
۹۔ ابونصر فارابی
۱۰۔ محمد بن زکریا رازی
۱۱۔ حکیم ابومحمد العدلی القاینی
۱۲۔ ابوسہیل دیجن بن رستم کوہی
۱۳۔ حکیم ابوالوفا بوزرجانی م:۳۸۸ھ
۱۴۔ ابوالقاسم علی بن الحسن العلوی المعروف بابن الاعلم م:۳۷۵ھ
۱۵۔ ابن مسکویہ م:۴۲۱ھ
۱۶۔ ابن ہیثم م:۴۳۰ھ
۱۷۔ اخوان الصفا (جماعت حکماء)
۱۸۔ شیخ بوعلی سینا م:۴۲۸ھ
۱۹۔ ابوریحان بیرونی م:۴۴۰ھ

۲۰۔ ابوسلیمان محمد بن طاہر بن بہرام سجستانی منطقی

۲۱۔ ہرکیاابوالحسن کوشیار بن بسان ابن باشہری جیلی

۲۲۔ امام غزالی

۲۳۔ ابوالبرکات بغدادی

۲۴۔ حکیم ابوالقاسم الحسین بن الفصلا لراغب الاصفہانی

دوسری جلد میں عمر خیام سے لے کر محمد بن عبدالکریم مہندس تک کے ۴۲ حکمائے اسلام کے مستند حالات وسوانح ان کے علمی کارناموں نیز فلسفیانہ اصول ونظریات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ عمر خیام م:۱۱۳۲ھ

۲۔ میمون بن نجیب الواسطی

۳۔ ابوحاتم المظفر الاسفزاری

۴۔ ابوالعباس اللوکری

۵۔ ابوالفتح کوشک

۶۔ عبدالرحمٰن الخازن

۷۔ امیہ بن عبدالعزیز بن ابی الصلت

۸۔ ابن باجہ م:۱۱۳۸ھ

۹۔ ابن طفیل م:۱۱۵۸ھ

۱۰۔ شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی مقتول م:۱۱۹۲ھ

۱۱۔ ابن رشد م:۱۱۹۸ھ

۱۲۔ امام رازی م:۱۲۰۹ھ

۱۳۔ سیف الدین آمدی

۱۴۔ سدیدالدین بن رقیقہ

۱۵۔ نصیرالدین طوسی م:۱۲۷۴ھ

۱۶۔ علامہ قطب الدین شیرازی	م:۱۲۱۰ھ
۱۷۔ قاضی عضد الدین	م:۱۲۵۵ھ
۱۸۔ قطب الدین رازی	م:۱۲۷۵ھ
۱۹۔ علامہ سعد الدین تفتازانی	م:۱۲۹۱ھ
۲۰۔ علی بن محمد السید الشریف	م:۱۴۱۳ھ
۲۱۔ خواجہ زادہ	
۲۲۔ علامہ جلال الدین دوانی	م:۱۵۱۲ھ
۲۳۔ علاء الدین علی طوسی	
۲۴۔ علی بن محمد قوشجی	م:۱۴۷۳ھ
۲۵۔ میر محمد باقر داماد	
۲۶۔ محمد بن ابراہیم شیرازی	م:۱۶۴۰ھ
۲۷۔ ملا قطب الدین شہید	
۲۸۔ ملا نظام الدین	
۲۹۔ مولانا عبد العلی بحر العلوم	
۳۰۔ ملا حسن	
۳۱۔ ملا مبین	
۳۲۔ مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی	
۳۳۔ مولانا فضل حق امام خیر آبادی	
۳۴۔ مولانا فضل حق خیر آبادی	
۳۵۔ مولانا عبد الحق خیر آبادی	
۳۶۔ قاضی مبارک گوپاموی	
۳۷۔ مولوی حمد اللہ سندیلوی	
۳۸۔ ملا محمود جون پوری	

۳۹۔ ملامحبّ اللہ بہاری

۴۰۔ مولوی محمد یحییٰ بہاری

۴۱۔ زین الدین عمر بن سہلان الساوی

۴۲۔ محمد بن عبدالکریم مہندس

کتاب کے آخر میں ہندوستان کے حکماء کے مختلف خانوادوں مثلاً فرنگی محل اور خیر آباد وغیرہ کے مشہور حکماء کے حالات اور ان کی کاوشوں کی تفصیل ہے۔

ان دونوں جلدوں سے فلسفہ اسلام کی عہد بہ عہد تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ تاریخ علوم و فنون اور تہذیب اسلامی کے ضمن میں فلسفہ اسلام کی تاریخ کی یہ بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ دونوں جلدیں علی الترتیب ۱۹۵۳ و ۱۹۵۶ء میں دارالمصنّفین سے شائع ہوئیں۔

۱۰۔ حیات شبلی

برادرانہ اور وطنی تعلق کی بناپر علامہ شبلی کے حالات و سوانح کی ترتیب کا کام ناظم دارالمصنّفین مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا عبدالسلام ندوی کے سپرد کیا۔ چنانچہ انہوں نے مکاتیب شبلی اور بعض دوسرے ذرائع کی مدد سے اس کو قلم بند کیا مگر اس میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی وغیرہ کو روح نظر نہیں آئی۔ اس لئے سید صاحب نے دوسری حیاتِ شبلی لکھی جس میں مولانا عبدالسلام ندوی کی حیاتِ شبلی سے بھرپور استفادہ کیا جس کا اعتراف خود انہوں نے حیاتِ شبلی کے مقدمہ میں کیا ہے۔ (۲۷) اس کا مسودہ کتب خانہ دارالمصنّفین میں محفوظ ہے۔ اسے شایع کر کے ہمیشہ کے لئے محفوظ کیا جاسکتا ہے۔

۱۱۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز

یہ علامہ شبلی کے سلسلہ نامور فرمانروایان اسلام کی ایک کڑی ہے۔ اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سوانح عمری اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ ان کی سوانح کے ساتھ اس عہد کی مکمل تاریخ وتہذیب اسلامی بھی اس میں آگئی ہے۔ دیباچہ میں بنوامیہ کی تاریخ کے سلسلے میں اس کے

دورحکومت کے حدود بتائے گئے ہیں۔مولاعبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ:

''تاریخ اسلام میں بنوامیہ اورعباسیہ باہم حریف ومقابل ہیں لیکن بنوامیہ کونہ صرف عباسیہ پر بلکہ تمام فرماں روایان اسلام پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ انہوں نے اسلامی حدودحکومت کو اپنے زور بازو سے اس قدر وسیع کردیا کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔خلفائے راشدین کے زمانے تک صرف عرب،شام،مصراورایران اسلام کے حدودحکومت میں داخل تھے لیکن خلفائے بنوامیہ نے اپنے دورحکومت کواس نقطہ کو دائرہ اوراس حباب کودریا کردیا۔''(۲۸)

اس کے بعدحضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نسب، ولادت وطن اور تعلیم وتربیت کا ذکر ہے۔اس میں ان کی ابتدائی سیاسی سرگرمیوں کا بھی ذکر ہے۔پھرازواج واولاد،حلیہ،اخلاق و عادات،اعمال وعبادات کا احوال لکھا گیا ہے۔نیز ان کی سیاست وحکومت کی مفصل تاریخ ہے۔ آخر میں سلطنت بنوامیہ کے زوال کے اسباب پر بحث کی گئی ہے۔

علامہ شبلی نے بنوامیہ میں ولید بن عبدالملک کو ہیروقراردیا تھا مگر مولانا عبدالسلام ندوی نے ولید کے بجائے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ذات گرامی کومنتخب کیا۔اس کا سبب بیان کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ:

''خلفائے اسلام کا قابل فخر کارنامہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے دنیا کواس نقطہ روحانی [عہدرسالت] سے آگے بڑھایا بلکہ ان کا حقیقی شرف یہ ہے کہ انہوں نے زمانے کواس قدر پیچھے ہٹایا کہ وہ عہد صحابہ سے جا کرمل گیا۔............... حضرت عمر بن عبدالعزیز ایسے شخص ہیں جنہوں نے زمانے کی باگ پھیر کراس کوعہد صحابہ سے ملادیا۔''(۲۹)

سیرت عمر بن عبدالعزیز علامہ شبلی نعمانی کی مشہورزمانہ کتاب الفاروق کے انداز پر تاریخی سوانح عمری ہے۔جس سے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد کی مفصل تاریخ سامنے آجاتی ہے۔اسے دارالمصنّفین نے ۱۹۱۹ء میں شائع کیا۔یہ بھی مولانا کی مقبول ترین کتابوں میں ہے۔

۱۲۔شعرالہند

یہ مولانا عبدالسلام ندوی کی شاہکار اور دارالمصنّفین کی مایہ افتخار کتاب ہے۔ دوحصوں پر مشتمل اس کتاب کو دارالمصنّفین نے علی الترتیب ۱۹۲۵ء-۱۹۲۶ء میں شائع کیا۔ اب تک اس کے دسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

شعرالہند کے پہلے حصے میں اردو شاعری کی ابتداء سے دورِ جدید کے شعراء فانی بدایونی [۱۹۷۹-۱۹۴۱ء] حسرت موہانی [۱۸۸۱-۱۹۵۱] اصغر گونڈوی [۱۸۸۴-۱۹۳۶ء] شاد عظیم آبادی [۱۸۸۶-۱۹۲۷ء] عزیز لکھنوی [۱۸۸۰-۱۹۸۴ء] اکبرالہ آبادی [۱۸۴۶-۱۹۲۱ء] جوش ملیح آبادی [۱۸۹۸-۱۹۸۲ء] اور علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد اردو شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور کی شاعری اور شعراء کے الگ الگ حالات ان کی شاعری کا پس منظر، خصوصیات، عہد بہ عہد کے تغیرات وانقلابات اور اس کے اسباب ومحرکات وغیرہ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ مقدمہ میں شعراء اردو کے قدیم تذکروں کا مختصر تجزیہ بھی ہے۔ خود مصنف نے کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

> ’’کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ شاعری کے چار ادوار قرار دئے گئے ہیں اور بہ ترتیب پہلے دور میں قدماء کی شاعری کے تاریخی انقلابات وتغیرات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد متوسطین کے دور کو لیا ہے، جس میں لکھنو کی شاعری کا آغاز ہوا ہے اور دلی ولکھنو کے دو الگ الگ اسکول قائم ہو گئے ہیں، اس لئے اس دور کی اصلاحات وتغیرات کی تاریخ کے ساتھ دلی اور لکھنو کی امتیازی خصوصیات اور اس دور کے مختلف اساتذہ..............
> اور ان کے تلامذہ کی شاعری پر ایک مفصل بحث ہے۔ پھر متاخرین کے دور کو لیا ہے اور اس دور میں لکھنو کی شاعری میں جو انقلاب پیدا ہوا ہے اس کی تفصیل ہے۔ سب کے اخیر میں شعرائے حال کے کارناموں کو بہ تفصیل بیان کیا ہے۔‘‘(۳۰)

آب حیات اور دیگر تذکروں کے باوجود آخر شعرالہند لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔؟اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ:

''اس پر بھی فارسی شاعری کی طرح تغیرات وانقلابات کے مختلف دور گذرتے رہے اور وہ اپنی فطری قابلیت کی بنا پر ہر دور کے مختلف موثرات اور محرکات سے متاثر ہوتی رہی اور ان موثرات نے اس کو ایک تاریخی چیز بنادیا لیکن افسوس ہے کہ آج تک اردو زبان میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی جو اردو شاعری کے ان تمام انقلابات و تغیرات کو نمایاں کرتی اور اس سے یہ معلوم ہوتا کہ انواع شاعری کی ترقی کے لحاظ سے موجودہ زبانوں میں اردو کا کیا درجہ ہے۔''(۳۱)

اردو کے آغاز وارتقاء پر ابتک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن شعرالہند کی تصنیف تک اس پر بہت کم تحریریں تھیں۔محمد حسین آزاد[۱۸۳۰-۱۹۱۰ء] نے آب حیات میں جو رائے قائم کی تھی مولانا عبدالسلام ندوی اس کی تائید کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''اردو زبان کا مکمل خاکہ اگرچہ عالم گیر کے زمانے میں تیار ہوا لیکن اس زبان کی داغ بیل عالم گیر کے زمانہ سے بہت پہلے پڑ چکی تھی اور تیمور کے زمانہ تک دکن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے ایک مستقل زبان پیدا ہوکر ان تمام شہروں میں پھیل چکی تھی جو مسلمانوں کے زیر اقتدار تھے۔تیمور کے بعد شمالی ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدرتی اختلاط کے علاوہ اکبر کے زمانہ میں مختلف قوموں کے اختلاط کا ایک مصنوعی سبب اور پیدا ہوگیا،یعنی اکبر نے قلعہ میں ایک زنانہ بازار قائم کیا جس میں عجمی،عربی،ترکی اور ہندی عورتیں اپنی اپنی دوکانیں لالا کر سجاتی تھیں اور بیگمات شاہی،امراء کی بیبیاں اور محل کے تمام لوگ آکر اس میں خرید وفروخت کرتے تھے۔اس تقریب سے باہم گفتگو کرنے کا خوب موقع ملتا تھا اور ایک نئی مخلوط زبان کا خاکہ تیار ہوتا جاتا تھا۔محل کے

لڑکوں نے یہ مخلوط زبان سیکھی اور باہر آ کر ارکان دولت کے فارسی محاورے سنے تو دونوں زبانوں کے اختلاط نے اس خاکہ میں اور بھی رنگ آمیزیاں کیں اور اس کا آب ورنگ اور بھی نمایاں ہو گیا۔'' (۳۲)

شعرالہند کی بنیادی خصوصیت اردو شاعری کی تنقیدی تاریخ ہے۔ اس میں مولانا نے کس طرح بحث کی ہے اس کا ایک نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری پر دربار کے کیا اثرات مرتب ہوئے اس کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''اس انقلاب نے اردو شاعری کی تاریخ پر گوناگوں اثر ڈالے، اگرچہ یہ افسوس ناک بات ہے کہ میر، سودا، مصحفی، جرأت اور انشاء وغیرہ کے کلام کا جو مخلوط مجموعہ شائع ہوا اس میں دلی اور لکھنو کا کلام امتیازی حیثیت سے علاحدہ علاحدہ نہیں کیا گیا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ دلی میں ان بزرگوں کا کیا رنگ تھا؟ اور لکھنو میں آ کر اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں، اس لئے ہم یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ مصحفی، جرأت، انشاء وغیرہ کے کلام میں جو غیر مطبوعہ تغیرات پیدا ہوئے وہ تمام تر لکھنو کی آب وہوا اور درباری تعلقات کا نتیجہ ہیں، تاہم اگر خواجہ میر درد اور ولی کے غیر مخلوط کلام کو دلی کی شاعری کا اصلی نمونہ قرار دیا جائے تو ہم کو اس دور کی شاعری سے مختلف نظر آتی ہے اور اس دور کا ہر شاعر درباری اثر سے متاثر نظر آتا ہے۔'' (۳۳)

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دلی اور لکھنو، دو ادبی اسکول کا نظریہ سب سے پہلے اسی کتاب سے قائم ہوا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس بحث وتجزیہ کی تحسین وستائش کی ہے۔ (۳۴) اس نقطہ نظر کا یہ فائدہ ہوا کہ اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ دو ادبی اسکول، دلی کا دبستان شاعری اور لکھنو کا دبستان شاعری وغیرہ اسی نظریہ کی وجہ سے وجود میں آئیں اور مطالعہ شعروادب کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔

شعرالہند کے دوسرے حصے میں اصناف شاعری غزل، ریختی، واسوخت، قصیدہ مرثیہ

،مثنوی، ڈراما اور مذہبی وصوفیانہ اور اخلاقی وفلسفیانہ شاعری پر ادبی ،تنقیدی اور تاریخی حیثیت سے تبصرہ کیا گیا ہے،جس سے اس کی پوری سرگذشت سامنے آ جاتی ہے ۔آخر میں شعر کے اجزاء وعنا صر وغیرہ بیان کئے گئے ہیں اور اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس حصے کے شروع میں اردو تنقید کی مختصر تاریخ بھی قلم بند کی گئی ہے۔

ان دونوں حصوں سے اردو شاعری کی گویا مکمل تنقیدی تاریخ سامنے آ جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ دارالمصنّفین اور مولانا عبدالسلام ندوی کی معرکہ آراء کتاب قرار دی گئی اور کئی یونیورسٹیوں نے نصاب میں شامل کیا غرض اسے بڑا حسن قبول نصیب ہوا۔اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

شعرالہند پر مولوی بابائے عبدالحق[۱۸۷۰-۱۹۶۱ء]کلیم الدین احمد [۱۹۰۸-۱۹۸۳ء] نیاز فتح پوری [۱۸۸۴-۱۹۶۶ء] نصیرالدین ہاشمی اور فیض الرحمٰن اعظمی [۱۹۲۸ - ۱۹۷۲ء] وغیرہ نے متعدد اعتراضات وارد کئے ہیں،جن میں بعض درست ہیں اور بعض غلط اور بے بنیاد،لیکن ان اعتراضات سے شعرالہند کی افادیت متاثر نہیں ہوتی۔اس طرح کے تمام اعتراضات کا جائزہ پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم نے تفصیل سے لیا ہے۔(۳۵)اس لئے اسے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

۱۳۔شعرالعرب

مولانا عبدالسلام ندوی نے شعرالہند کے بعد شعرالعرب کا آغاز کیا۔لیکن وہ اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔اس کا نا تمام مسودہ کتب خانہ دارالمصنّفین میں موجود ہے۔اس کے تعارف وتبصرہ پر مشتمل ڈاکٹر محمد عارف عمری نے ایک مفصل مضمون لکھا ہے۔(۳۶)اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے تقریباً تمام مباحث کو سمیٹ لیا تھا۔مثلاً عربی شاعری کی تاریخ،عرب شعراء کی اہمیت، جاہلی شعراء،مختلف اصناف سخن کا تجزیہ اور عہد بہ عہد عربی شاعری کا ارتقاء اور اس کے امتیازات وغیرہ تمام تفصیلات قلم بند ہوگئی تھیں۔اندلس کی عربی شاعری اور مغلوں کے عہد کی عربی شاعری اور اس کی خصوصیات وغیرہ کا جائزہ بھی لیا جا چکا تھا۔جدید دور کے شعراء اور ان کے

خصائص شاعری وغیرہ کی تفصیل بھی آ گئی تھی۔ غرض یہ کہ کتاب تقریباً مکمل ہوگئی تھی، مگر زیور طباعت سے محروم رہی۔ اس کا بعض حصہ عربی نظم ونثر کی تاریخ کے عنوان سے کئی قسطوں میں ماہنامہ معارف میں شائع ہو چکا ہے اور ایک مختصر حصہ مسودہ کی شکل میں محفوظ ہے، اس سلسلے کے مطبوعہ غیر مطبوعہ تمام مضامین کو جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جا سکتا ہے، تا کہ یہ بہتر اور جامع شکل میں آ سکے۔

۱۴۔ فقرائے اسلام

اس میں ان علماء اسلام کے حالات وسوانح اور ان کے علمی وعملی اور دینی کارناموں کی تاریخ لکھی گئی ہے جنہوں نے علم وفضل کے بلندترین مقام پر فائز ہونے کے باوجود فقروفاقہ اور درویشانہ زندگی بسر کی۔ کتاب کا آغاز سید الفقراء شہنشاہ کونین جناب سرور عالم ﷺ کے مقدس ذکر سے ہوا ہے۔ آخر میں ادب لطیف پر فقرائے اسلام کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> ''اس میں جن علماء کے حالات درج کئے گئے ہیں ان کے پڑھنے سے ان کو عبرت ونصیحت حاصل ہوگی جو اس زمانے میں علم و مذہب کے لئے مصائب کے برداشت کرنے سے جھجھکتے ہیں اور یہی اس رسالے کے لکھنے کا مقصد ہے۔'' (۳۷)

مولانا کا خیال ہے کہ علم اور دولت میں ہمیشہ بیر رہا ہے۔ اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ابتدائے اسلام ہی سے علم اور دولت میں ہمیشہ بیر رہا ہے اور یہ دونوں چیزیں ایک جگہ بہت کم جمع ہوئی ہیں۔ صحابہ کرام میں اصحاب صفہ کا گروہ خالص علمی گروہ تھا اور قراء کے ممتاز لقب سے یاد کیا جاتا تھا لیکن تمام صحابہ میں مقدس گروہ فقر فاقہ میں مبتلا تھا۔ صحابہ کرامؓ کے بعد اگرچہ امراء وسلاطین نے علوم وفنون کی اشاعت میں نہایت فیاضانہ طریقہ سے حصہ لیا

اوران کی فیاضیوں سے یہودیوں اور عیسائیوں تک نے فائدہ اٹھایالیکن
اس دور میں بھی سیکڑوں علماء فقر وفاقہ میں مبتلا نظر آتے ہیں اور تاریخ ہم کو
ان کی غربت وافلاس کی پردرد داستان سناتی ہے، اس بنا پر قدیم زمانے
میں تمام مذہبی اور عقلی علوم وفنون کی ترقیوں کا سبب صرف مالی کامیابیاں
نہ تھیں بلکہ اسلام نے علماء کے دلوں میں خالص مذہبی اور علمی شوق وولولہ
کا دارومدار کسب مال اور حصول دولت پر نہ تھا بلکہ وہ حصول دنیا کو اس پر
قربان کر کے نہایت زہدو قناعت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے اور یہ
صرف چند اشخاص کی مستثنیٰ حالت نہ تھی بلکہ تاریخ ورجال کی ہر کتاب میں
اس قسم کے حالات کثرت سے ملتے ہیں۔''(۳۸)

اس کتاب کے لکھنے کا خیال مولانا عبدالسلام ندوی کے دل میں علامہ شہاب الملتہ والدین احمد بن علی الدجی کی کتاب الفلاکتہ والمفلوکون کے دیکھنے سے آیا تھااور یہی کتاب فقرائے اسلام کا بنیادی ماخذ بھی ہے لیکن مولانا نے اس میں اس قدر اضافہ اور ترمیم وتنسیخ اور تلخیص کی ہے کہ یہ خود ان کی ایک تالیف ہوگئی ہے۔اس ترمیم وتنسیخ اور حذف واضافہ کی تمام تفصیلات مولانا نے مقدمے میں درج کردی ہیں۔اسے صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی، پنڈی بہاءالدین پنجاب نے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔یہ کتاب بھی اپنے موضوع پر انفرادیت رکھتی ہے۔اب اس موضوع پر کچھ اور کتابیں بھی شائع ہوگئی ہیں تاہم اس کی اہمیت اب بھی پورے طور پر قائم ہے۔

حواشی

(۱) مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں، ص ۲۷

(۲) اقبال کامل ص ۱۷۲

(۳) ابن یمین ص ۲

(۴) اردو، اورنگ آباد، جنوری ۱۹۲۸ء، ص/۷۶ ۴۷

(۵) مکاتیب شبلی، ج/۱، ص/۱۱۹، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۲۸ء

(۶) ایضاً۔جلد۱/ص۲۵۵/

(۷) اسوہ صحابہ حصہ اول ص ۷

(۸) اسوہ صحابہ اول ص۲۰۱

(۹) مولانا عبدالسلام ندوی، اسوۂ صحابہ ج ۱ مقدمہ، ص ۸، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۹۳ء

(۱۰) اسوہ صحابہ حصہ اول ص۲

(۱۱) اسوہ صحابیات ص ج

(۱۲) اسوۂ صحابیات حصہ دوم ص ۲، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۷ء

(۱۳) نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر حصہ دوم ص ۹۳

(۱۴) خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال ص ۱۴/، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء

(۱۵) اقبال کامل ص۳ص-۴

(۱۶) اقبال کامل ص۲۵۴

(۱۷) اقبال کامل ص۳۱۷

(۱۸) اقبال کامل ص۲۴۹

(۱۹) ماہنامہ معارف نومبر ۱۹۲۷ء

(۲۰) القضاء فی الاسلام ص۶۰-۶۱

(۲۱) امام رازی دیباچہ ص ۲۔ دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۲۲) مکاتیب واشعار ص۳۱

(۲۳) ایضاً ص۳۲

(۲۴) مکاتیب واشعار ص۳۱-۳۲

(۲۵) مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں، ص۳۱

(۲۶) ایضاً۔ص۵۳/

(۲۷) حیاتِ شبلی، ص۸

(۲۸) سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص۶

(۲۹) سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص۲

(۳۰) شعرالہند، اول، ص۳

(۳۱) شعرالہند اول ص۲

(۳۲) شعرالہند، اول، ص۱۲

(۳۳) شعرالہند حصہ اول ص۷۵-۷۶

(۳۴) تنقیدات عبدالحق ص۹۴

(۳۵) بحوالہ پروفیسر کبیر احمد جائسی، مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں، ص۲/۷-۹۲

(۳۶) ماہنامہ الرشاد، اعظم گڑھ، جنوری، فروری ۲۰۰۰ء

(۳۷) مولانا عبدالسلام ندوی، فقراء اسلام، ص۴

(۳۸) فقرائے اسلام ص۷۱

تراجم

مولانا عبدالسلام ندویؒ مصنف اورانشاء پرداز کی طرح ایک بڑے مترجم بھی تھے۔ انہوں نے کئی اہم اورگراں قدر کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ان کوترجمہ نگاری پر بڑا عبور حاصل تھا۔حقیقت یہ ہے کہ ان کے تراجم پراصل کا گمان ہوتا ہےاوراسی لئے ان کا شماراردو کے چند اہم اور کامیاب ترجمہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ابن خلدون ،انقلاب الامم، اسلامی قانون فوجداری، التربیۃ الاستقلالیہ، تاریخ فقہ اسلامی اورفطرت نسوانی وغیرہ اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ چند بڑے اہل قلم نے ان کی ترجمہ نگاری کی تحسین وستائش کی ہے۔جن میں مولانا ابوالکلام آزادبھی شامل ہیں۔

ترجمہ کےفن سے وہ کس قدرآشنا تھےاوراسے کس درجہ اہمیت دیتے تھے،اس کا اندازہ ان کےدرج ذیل خیالات سےلگایاجاسکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''غلطی سےترجمہ کےکام کوکوئی اہمیت نہیں دی جاتی اوراس کوایک حقیرعلمی یاادبی خدمت سمجھا جاتا ہے۔حالانکہ علمی وادبی حیثیت سے دوہی کام سب سے زیادہ مشکل اورسب سے زیادہ اہم ہیں،ایک تو بچوں کوسبق پڑھانا اور دوسرے ترجمہ کرنا اس لئے جولوگ ترجمہ کواوریجنل تصنیفات سےکم رتبہ سمجھتے ہیں وہ دماغی اورخودبینی میں مبتلا ہیں۔مسلمانوں کی علم و فن کی ابتداءاوراشاعت یونانی کتابوں کےترجموں ہی سے ہوئی۔''(۱)

غالبًا اسی تصورراسخ کی وجہ سےمولانا عبدالسلام ندوی نے زندگی بھرترجموں سے سروکاررکھا۔یہاں ان کی مترجمہ کتابوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے تا کہ ان کی ترجمہ نگاری کی اہمیت کااندازہ ہوسکے۔

ا۔ابن خلدون

علامہ ابن خلدون کی عظمت و بلند پا یگی اوران کے کارناموں کی اہمیت اورافادیت کے پیش نظر دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں ان کے حالات وسوانح ،فضل وکمال ،اوران کے علمی وتحقیقی کارناموں کی تدوین کا منصوبہ زیرغور تھا کہ ابن خلدون پرمشہورمصری عالم ڈاکٹر طہٰ حسین کی معرکہ آراءفرنچ کتاب کا عربی ترجمہ شائع ہوا۔ یہ ترجمہ خود مصنف کی خواہش پر ۱۹۲۵ء میں محمد عبداللہ عنان نے کیا تھا ۔ دارالمصنّفین نے اس عربی ترجمے کو اردو کا جامہ پہنانے کی ذمہ داری مولانا عبدالسلام ندوی کے سپرد کی ، چنانچہ انھوں نے نہایت خوبی کے ساتھ اسے اردو میں منتقل کیا۔(۲) اس کتاب میں ابن خلدون کے حالات وسوانح اوران کے سیاسی ،اقصادی ، اجتماعی اورعمرانی نظریات اورفلسفہ پرمفصل بحث وتحقیق پیش کی گئی ہے۔ابن خلدون کی تصانیف اورفن تاریخ سے متعلق ان کے کارناموں کی بھی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔مقدمہ مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ہے۔اسے دارالمصنّفین نے ۱۹۴۰ء میں شائع کیا۔

۲۔انقلاب الامم

یہ مشہورفرانسیسی عالم ومفکرموسیو لی بان کی کتاب ''قوموں کی ترقی وتنزل کے نفسی قوانین'' کے عربی ترجمہ سرتطورالامم [ازاحمد فتحی زغلول پاشا] کا نہایت رواں اورسلیس وشگفتہ اردو ترجمہ ہے۔اسے بے حد پسند کیا گیا۔اس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا کہ:

> ''مولوی عبدالسلام صاحب نے اصل کتاب کا ترجمہ اتنا پرزور،موثر، بلیغ اوردلچسپ کیا ہے کہ اس سے بہتر نہیں ہوسکتا۔''(۳)

اس کتاب میں ان نفسی اصول وقواعداوراخلاقی قوانین کی توضیح وتشریح کی گئی ہے،جن سے قوموں کی ترقی وتنزلی وابستہ ہے۔کتاب کا تعارف خودمترجم مولانا عبدالسلام ندوی نے ان الفاظ میں کرایا ہے:

> ''اس وقت جو کتاب آپ کے سامنے ہے وہ بھی دریائے نیل کی ایک لہر،

موسیو گستاولی بان جوتمدن عرب اور تمدن ہند کے مصنف ہونے کی حیثیت سے ہندوستان میں محتاج تعارف نہیں ہیں، ان کی ایک فرنچ کتاب کے عربی ترجمہ کو ہم نے ان صفحات کے ذریعہ اردو میں منتقل کیا ہے جس کا اصلی نام (Les Lois Psychologegius Delevalution Des Pueple) یعنی قوموں کی ترقی وتنزل کے نفسی قوانین'' ہے جس میں ان نفسی اصول اور اخلاقی قوانین کی تشریح گئی ہے جن کے ساتھ اقوام عالم کی ترقی وتنزلی وابستہ ہے۔ جس طرح ہر شخص میں ایک مخصوص روح ہوتی ہے جس کے مطابق وہ اپنے تمام ذاتی کام انجام دیتا ہے، اسی طرح ہر قوم کے قالب میں بھی ایک خالص روح ہوتی ہے۔ جس کے مخصوص اخلاق و خواص ہوتے ہیں جو درحقیقت اس قسم کی تمام حرکات ترقی وتنزلی کا محور ہیں ۔ یہ کتاب اسی قومی روح کی جلوہ طرازیوں کا مظہر ہے۔ آج کل جب کہ تمام دنیا میں ایک عام قومی کشمکش برپا ہے، جب کہ ہندوستان اپنے قومی تار و پود کو مستحکم کر رہا ہے، جب کہ فرزندان اسلام اپنی بربادی کے ماتم سے فارغ ہو کر آئندہ کے لئے شاہراہ عمل کی تجویز میں مصروف ہیں، امید ہے کہ یہ کتاب ان کے خیالات کی توسیع میں بہت کچھ مدد دے گی۔''(۴)

شروع میں مولانا نے جو طویل اور مبسوط مقدمہ لکھا ہے وہ موضوع سے ان کی گہری واقفیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں انہوں نے قوموں کے عروج وزوال کے فلسفہ پر اسلامی نقطہ نظر سے بحث کی ہے اور بعض علمائے اسلام مثلاً ابن خلدون کے افکار ونظریات پیش کئے ہیں۔ دارالمصنفین نے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۸ء میں شائع کیا۔ دارالمصنفین سے شائع ہونے والی مولانا عبدالسلام ندوی کی یہ پہلی کتاب تھی۔ اب اس کا جدید ایڈیشن بھی ۱۹۹۹ء میں طبع ہو گیا ہے۔

۳۔ اسلامی قانون فوجداری

مولانا عبدالسلام ندوی کی اس کاوش کا علی العموم ذکر نہیں کیا جاتا رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ

اس کتاب پر مترجم کی حیثیت سے ان کا نام درج نہیں ہے۔ حالانکہ یہ معارف پریس اعظم گڑھ میں مولانا مسعود علی ندوی کے زیر اہتمام طبع ہوا ہے۔ اس کا مقدمہ بھی مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے ہے۔ یہ ترجمہ انہوں نے میر شریف احمد وکیل حیدرآباد کی فرمائش پر کیا ہے۔ اس کی طباعت انہیں کے صرفے سے ہوئی ہے۔ یہ تمام تفصیلات مقدمہ میں درج ہیں۔

مولانا سلامت علی خاں کی تصنیف کتاب الاختیار جو انہوں نے ۱۲۱۲ھ مطابق ۹۸ - ۱۷۹۷ء میں لکھی تھی۔ جس میں تعزیرات و جرائم کے متعلق اسلامی قوانین فوجداری کی تمام دفعات کو مختلف اصول وابواب میں فقہ کی مستند و معتبر کتابوں کے حوالے سے جمع کر دیا گیا ہے اور ساتھ ہی فارسی ترجمہ بھی درج کر دیا گیا ہے۔ مولانا نے انہیں عربی و فارسی عبارتوں اور اقتباسات کا ترجمہ کیا ہے۔ مولانا نے یہ ترجمہ بھی بڑی دلجمعی کے ساتھ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی زبان میں بڑی سلاست، روانی و برجستگی پیدا ہوگئی ہے۔ مزید یہ کہ دفعات کا نمبر شمار اوران کے عنوانات قائم کئے ہیں، جس سے اصل مسئلہ تک پہونچنے میں سہولت ہوگئی ہے۔ ۴۵۳ رصفحات کی یہ کتاب مئی ۱۹۲۹ء میں مطبع معارف اعظم گڑھ میں طبع ہوئی۔

۴۔ التربیۃ الاستقلالیہ

یہ الفونس ایکروس کی فرنچ کتاب ''انیسویں صدی کا امیل'' کے عربی ترجمے کا اردو ترجمہ ہے۔ الفونس ایکروس نے فلسفیانہ انداز میں بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق مراسلات و یادداشت لکھے تھے۔ اس کو ان کے ایک عقیدت مند نے یکجا شائع کیا۔ ایکروس بچوں کو ایسی تعلیم دینے کا قائل تھا جس میں آزادی واستقلال کی روح پیدا ہو۔ اور ان کے افعال خود ان کے علم کے مطابق ہوں۔ تقلید و جبر کی آمیزش نہ ہو۔ یہ شذرات و مراسلات اس نے افسانوی انداز میں دو میاں بیوی فرض کر کے لکھے ہیں، تاہم تعلیم اور فلسفہ تعلیم پر اس کے خیالات بڑے مفید ہیں۔ چنانچہ مفتی محمد عبدہ نے اپنے ایک شاگرد شیخ عبدالعزیز آفندی سے اس کا عربی ترجمہ التربیۃ الاستقلالیہ کے نام سے کرایا جو مجلّہ الہلال مصر میں شائع ہوا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی خواہش پر اسے اردو میں منتقل کیا۔ البتہ انہوں نے پوری کتاب کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ غیر ضروری

،غیر مفید اور مصنف کے ذاتی اور خانگی معاملات سے صرف نظر کیا ہے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں حالت حمل اور صغیر السن بچوں کی نگہ داشت اور تربیت کے اصول بیان کئے ہیں۔ دوسرے میں بچوں کی تربیت تیسرے میں بلوغت سے پہلے اور چوتھے میں بلوغت کے بعد کے اصول تعلیم وتربیت درج ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے شروع میں ایک طویل اور شاندار مقدمہ لکھا ہے۔ جس میں قدیم وجدید تعلیمی افکار ونظریات کے نقائص پر بحث وتحقیق پیش کی ہے۔ چونکہ اس سے ان کے نظریہ تعلیم کی توضیح ہوتی ہے اس لئے اس کے اہم مباحث یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ قدیم تعلیم کے علمی واخلاقی نقائص کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مذہبی مدارس کے معلمین علوم وفنون کے قواعد کی تحقیق ان کی توضیح و تشریح اوران کے ضبط واستقصاء میں اس قدر غلو کر دیتے ہیں کہ نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے اور توضیح ابہام اور تفصیل اجمال بن جاتی ہے۔ اس کے برخلاف سرکاری مدارس میں صرف حفظ قواعد پر قناعت کر لی جاتی ہے اور معانی ومطالب سے غرض نہیں ہوتی اس لئے افراط وتفریط سے بچنے کے لئے توسط و اعتدال کی ضرورت ہے۔ یعنی مذہبی مدارس کی افراط اور سرکاری مدارس کی تفریط کو چھوڑ کر ایک معتدل طریقہ تعلیم اختیار کرنا چاہئے۔'' [التربیۃ الاستقلالیہ ص۱۲]

اس کے بعد قدیم تعلیم کے نتائج لکھے ہیں اور انہیں افسوس ناک قرار دیا ہے۔ پھر جدید تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''تعلیم قدیم کے ان افسوس ناک نتائج کے بعد ہماری نگاہ جدید تعلیم کے نتائج پر پڑتی ہے، جس کا آج ہر طرف شور ہے لیکن افسوس ہے کہ اس عالم شباب میں بھی اس کے چہرے پر وہی جھریاں نظر آتی ہیں جنہوں نے قدیم کہن سال تعلیم کے چہرے کو بدنما بنا دیا ہے۔ قدیم تعلیم کو پیچیدگی، اغلاق اور کثرت شروح وحواشی نے علمی حیثیت سے معمہ بنا دیا ہے جو یہ

مشکل حل ہوتا ہے اور حل ہو جانے کے بعد بھی اس سے کوئی نتیجہ نہیں حاصل ہوتا لیکن جدید تعلیم اس قدر واضح ،اس قدر آسان اور اس قدر سہل بنادی گئی ہے کہ طلباء میں سطحیت کے سوا کسی قسم کے عمیق غور وفکر کا مادہ نہیں پیدا کرسکتی۔استاذ اور شاگرد دونوں کو اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ ان کا کام صرف امتحان کے لئے تیاری کرنا اور کرانا ہے،اس لئے اساتذہ طلبہ کو اہم مقامات از بر کرا دیتے ہیں اور وہ طوطے کی طرح ان الفاظ کو رٹ لیتے ہیں۔اکثر طلباء سال بھر کتاب کو بند رکھتے ہیں اور جب امتحان کا زمانہ قریب آتا ہے تو نہایت روانی کے ساتھ کئی کئی بار اس عبارت کو دہرا کر کامیاب ہو جاتے ہیں،اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس عالم گیر تعلیم نے آج تک کوئی دقیق النظر عالم،کوئی وسیع النظر مصنف،علم دوست طالب علم اور کوئی سنجیدہ مقرر نہیں پیدا کیا۔'' [التربیۃ الاستقلالیہ ص۱۴]

مولانا عبدالسلام ندوی تعلیم وتدریس کے میدان میں ''اسلامی طریقہ تعلیم تربیت'' کو ترجیح دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ:

''آج اگر چہ دنیائے اسلام میں قدیم طریقہ تعلیم کی بہت کچھ اصلاح ہو چکی ہے،تاہم ابھی ہم میں اور قدما کی علمی،مذہبی اور اخلاقی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے،بلکہ جب تک زمین وآسمان قائم رہیں گے یہ فرق باقی رہے گا کیونکہ ہم نے صرف نصاب تعلیم میں قدما کی پیروی کی ہے حالانکہ ہماری علمی ترقی کا اصلی زمانہ وہ تھا جب کہ سرے سے کوئی نصاب تعلیم نہ تھا،نہ کوئی نظام تعلیم۔صرف ایک علمی ذوق،ایک مذہبی تشنگی اور ایک اخلاقی ولولہ تھا جو ہمارے نصاب تعلیم،ہمارے نظام تعلیم،ہماری عظیم الشان مدارس کی عمارت اور ہمارے تمام تعلیمی اصول وضوابط کا قائم مقام تھا اور ہم نے اب تک ان چیزوں میں تقلید نہیں کی ہے۔صرف اتنا کیا ہے کہ ان کی بہترین تصانیف کو نصاب تعلیم میں داخل کر لیا ہے۔جس

سے ہم میں فی الجملہ وسیع الخیالی پیدا ہوگئی ہے، لیکن قدما کا طریقہ تعلیم اور بھی متعدد اجزا پر مشتمل تھا جن کے مجموعہ کو ''اسلامی طریقہ تعلیم و تربیت'' کا مقدس لقب دیا جاسکتا ہے۔ آج جو جدید طریقہ تعلیم و تربیت ہم کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے ہے۔ اس کے مقابل میں یہ اسلامی طریقہ تعلیم و تربیت نہایت سادہ، بالکل بے رنگ اور سخت بے کیف نظر آئے گا، تاہم یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ دنیا کی اصلاح ہمیشہ سادہ، واضح اور آسان ہی طریقہ سے ہوئی ہے۔ اور خود اسلام کو ملت لمعہ بیضا یعنی آسان اور روشن بنا کر خدا نے دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا ہے اور یہی وضاحت اور سادگی اسلام کے طریقہ تعلیم و تربیت میں بھی نظر آتی ہے۔''

[التربیۃ الاستقلالیہ ص ۶۲]

۳۰۷ صفحات کی یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی طرف سے شائع ہوئی۔ مسلمانوں کی علمی و تعلیمی پسماندگی کے پس منظر میں یہ کہنا کہ اس کی اشاعت سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچا اور اب بھی یہ اسی درجہ مفید اور کارآمد ہے، غلط نہ ہوگا۔

۵۔ تاریخ الحرمین الشریفین

۱۳۲۷ھ میں عباس حلمی پاشا خدیو مصر نے فریضہ حج ادا کیا۔ اس سفر حج کے مشاہدات اور تاثرات کو اس کے دوست محمد لبیب البتونی نے الرحلۃ الحجازیہ کے نام سے اس خوبی سے مرتب کیا کہ نہ صرف سفرنامہ حج رہا بلکہ حرمین شریفین کی مفصل مبسوط اور جامع تاریخ بھی بن گیا۔ زیر نظر کتاب دراصل اسی سفرنامے کے ترجمہ و تلخیص اور مفید اضافوں کا مجموعہ ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کے تراجم پر اصل کا گمان ہوتا ہے مگر اس کتاب میں مولانا نے جو اضافے کئے ہیں اور بعض طویل مباحث کی جو تلخیص کی ہے۔ اس سے یہ کتاب حقیقتاً ترجمہ کی جگہ اصل معلوم ہوتی ہے۔ کتاب کی ابتداء مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدمہ سے ہوئی ہے، جس میں انہوں نے تاریخ الحرمین الشریفین کو ارض حرم کی جامع تاریخ بتایا ہے اور خود بھی قرآن و حدیث کی روشنی میں ارض

حرم کی مذہبی اور تاریخی اہمیت پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔

فاضل مترجم نے ابتداء میں مکہ معظّمہ کے حالات کے تحت ارض حرم کی حکومت، مقامات، شاہ راہیں، لوگوں کے اخلاق و عادات، رسم و رواج، لباس، زیارت گاہیں، ڈاکخانوں، قہوہ خانوں، قلعوں، کتاب خانوں، تجارت، سکوں، بازاروں اور شفا خانوں کی تفصیل دی ہے۔ نیز مکہ مکرمہ کی تاریخ، حکومت اشراف کا قیام، نجد میں آل سعود کی حکومت کا آغاز، غلاف کعبہ، حج طواف، حجر اسود، جامہ احرام، منیٰ میں رجم اور قربانی وغیرہ کی مفصل تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔ منیٰ کے آثار کا بالتفصیل ذکر ہے۔ پھر عمالیق کی لغوی تحقیق، چاہ زمزم اور حجر اسود کی تاریخی حیثیت اور لفظ مکہ کے اشتقاق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد مدینہ منورہ میں خدیو مصر کی حاضری کے احوال کے ساتھ مدینہ کے مختلف ناموں، وجہ تسمیہ، قدیم باشندوں اور یہود و نصاریٰ کا تذکرہ ہے۔ ہجرت کے پس منظر کے ساتھ مدینہ اور اس کی مساجد کی تاریخ، تعمیر نو کی تاریخ، مدینہ کے مکانات، سڑکیں، تجارت، حمام، خانقاہیں، کنویں، نہر، باغ وادیاں، زیارت گاہیں اور کتاب خانوں کا مفصل تذکرہ ہے۔ آخر میں مدینہ کی سیاسی حیثیت پھر آب و ہوا۔ وہاں کے باشندوں کے عام اخلاق و عادات، خصائص و امتیازات اور قرآن مجید اور مدینہ کے عنوان سے معلومات پیش کئے گئے ہیں۔ جس میں شہر مدینہ کے خصائص کا بھی ذکر ہے۔ اس طرح یہ کتاب حرمین کی مفصل تاریخ ہو گئی ہے اور اس میں اس وقت کے مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے بعض سیاسی، تہذیبی اور تمدنی حالات بھی آ گئے ہیں۔ مسجد نبوی کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

> ''حضرت ابوایوب انصاریؓ اور حضرت عثمانؓ کے مکانات مشرقی جانب واقع تھے اور آج بھی بہ تغیر یہ صورت موجود ہے۔ حضرت عثمان کے گھر کے ایک گوشے میں جو حرم کے مقابل واقع ہوا ہے ایک جالی دار حجرہ ہے۔ جس کے باہر ایک لوح لگی ہوئی ہے اور اس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ ''مقتل عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ'' شیخ حرم معمولاً اسی گھر میں قیام پذیر رہتے ہیں۔ آل عمرؓ کے مکانات مسجد شریف کے جنوب میں واقع تھے اور اب بھی قبلہ کے رخ سے حجرہ شریفہ کے مقابل اور حرم سے متصل ایک

باغ موجود ہے۔جس کے باہر ایک دروازے پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں
''دیارآل عمرؓ۔''(۵)

اس کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ:

''مدینہ کے حالات میں بطور خود بہت سی معلومات کا اضافہ کر دیا ہے اور اس طرح مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی حیثیت سے حرمین کی ایک نہایت مستند تاریخ مرتب ہوگئی ہے جو ایک طرف تو مسلمانوں کے دلوں میں حج اور مناسک حج کے فوائد، اسرار اور خصائص وحکم کا ایک غیر فانی یقین پیدا کر دے گی، دوسری طرف ایام حج میں مسلمانوں کی رہنمائی کا کام بھی دے گی اور اس کے ذریعہ سے وہ لوگ وہاں کے امراض اور بہت سے خطرات وتوہمات سے محفوظ رہیں گے۔''(٦)

جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت اردو میں حرمین کی تاریخ پر کوئی مستند اور مستقل تصنیف نہ تھی۔مولانا نے اس کے ذریعہ اردو زبان کی ایک بڑی کمی کو پورا کیا تھا۔البتہ اب اس کتاب کے مندرجات اور موجودہ حرمین کے منظرنامے میں کافی فرق ہو چکا ہے۔ ۲۲٦/ صفحات پر مشتمل یہ کتاب صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پنڈی بہاء الدین پنجاب نے شائع کی تھی۔اب یہ کتاب نایاب ہے۔

٦۔تاریخ فقہ اسلامی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے پیش نظر فکر شبلی کے مطابق علوم اسلامیہ کی تاریخ کی تدوین بھی تھی۔ چنانچہ عالم عرب کے مشہور عالم ومورخ محمد الخضری کی کتاب تاریخ التشریع الاسلامی شائع ہوئی تو مفید مطلب خیال کر کے مولانا عبدالسلام ندوی سے اس کے ترجمہ کی خواہش کی گئی۔''تاریخ فقہ اسلامی'' دراصل اسی کا اردو ترجمہ ہے۔اس میں فقہ اسلامی کے چھ ادوار قائم کر کے ہر عہد کے فقہ کی مفصل تاریخ لکھی گئی ہے۔اور ہر عہد کے فقہاء کرام کے حالات وسوانح اور ان کے فقہی مذاہب، فقہی تغیرات وانقلابات، خصوصیات اور امتیازات

شرح وبسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔اس سے صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعین کی فقہی خدمات کے ساتھ مدینہ، مکہ، کوفہ، بصرہ، شام، مصر، یمن کے فقہاء اوران کی فقہی خدمات کی پوری تفصیل آ گئی ہے۔نیز فقہ اسلامی کی ترقی کے اسباب وعلل کی بھی وضاحت ہوگئی ہے۔جس سے فقہ اسلامی کے عہد بہ عہد ارتقاء کی مکمل تاریخ سامنے آ جاتی ہے۔اسے دارالمصنّفین نے ۱۹۲۷ء میں شائع کیا تھا۔اب تک اس کے کئی ایڈیشن طبع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔یہ کتاب بعض مدارس کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

۷۔فطرت نسوانی

مولانا عبدالسلام ندوی کو خواتین کی اصلاح وترقی اوران کی تعلیم وتربیت سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''مجھ کو ابتداء ہی سے عورتوں کی تعلیم وترقی سے دلچسپی ہے اوراس کے متعلق میں نے قدیم وجدید دونوں لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے لیکن میں ان دونوں میں کسی کو افراط وتفریط سے خالی نہیں پاتا۔ایک طرف تو ہمارے قدیم افسانہ نویس ہیں جنہوں نے عورتوں پر ہر قسم کے اخلاقی اورمعاشرتی الزامات لگائے ہیں، دوسری طرف دور جدید کے انشا پرداز ہیں جنہوں نے ہر میدان میں عورت کو مرد کے دوش بدوش کھڑا کر دیا ہے لیکن اگر ان تحریروں کو پیش نظر رکھ کر عورت کا نظام تعلیم وتربیت قائم کیا جائے تو دنیا کا توازن فطری قائم نہیں ہوسکتا۔'' [فطرت نسوانی ص۵]

مولانا نے اس موضوع پر کئی تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔اسوہ صحابیات کا ذکر گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے، یہاں اس سلسلہ کی ان کی ایک اور کاوش فطرت نسوانی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پروفیسر ہنری مارٹن فرانسیسی نے خواتین کی نفسیات پر لکچر زدئے تھے۔اس کی وفات کے بعد اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔مولانا عبدالسلام ندوی نے اس کتاب کا نام ''عورت کا خلق اور مردوعورت کا طبعی موازنہ'' لکھا ہے۔امیل زیدان ایڈیٹر الہلال مصر نے اس کا عربی میں ترجمہ

کیا۔''فطرت نسوانی''اسی کی تلخیص ہے۔اس میں فلسفیانہ انداز میں خواتین کی اخلاقی، معاشرتی اور ذہنی تاریخ تحریر کی گئی ہے۔نیز مرد وعورت کی فطرت و اخلاق کا فلسفیانہ مواز نہ کیا گیا ہے۔آخری باب میں تحریک نسواں کی مفصل تاریخ ہے۔اس کتاب کی افادیت آج بھی کسی لحاظ سے کم نہیں۔اسے صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی، پنڈی بہاء الدین پنجاب نے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا تھا۔یہ تلخیص بھی اب گویا نایاب ہے۔پروفیسر کبیر احمد جائسی نے اس کے ایک اور ایڈیشن کا ذکر کیا ہے۔(۷) جو کسی ماجد نامی شخص کے نام سے پاکستان سے شائع ہوا ہے۔اس نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب اسے پراگندہ حالت میں ملی تھی،اس لئے از سرنو مرتب کر کے شائع کیا جارہا ہے۔حالانکہ جائسی صاحب نے اس کے جن مشمولات کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے فطرت نسوانی کو ہو بہو شائع کرلیا ہے۔چونکہ جائسی صاحب نے اصل فطرت نسوانی کو دیکھا نہیں تھا اس لئے اس کا موازنہ نہیں کر سکے۔بہر حال ماجد کی اس بد دیانتی پر افسوس کے علاوہ کیا کیا جا سکتا ہے۔البتہ غور طلب بات یہ ہے کہ اگر توجہ نہ دی گئی تو مولانا مرحوم کی وہ کتابیں جو پنڈی بہاء الدین سے شائع ہوئی ہیں اور جو اب نایاب ہیں انہیں کوئی اور بھی ماجد مل سکتا ہے۔اور اگر مل بھی گیا ہو تو کیا تعجب۔اب جائسی صاحب جیسی نظر والا کون ہے؟ جو اس بد دیانتی کی پردہ دری کرے۔

حواشی

(۱) مقالات عبدالسلام ص ۱۶۶

(۲) مولانا سید سلیمان ندوی،مقدمہ ابن خلدون، ص ب دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۱۹۴۰ء

(۳) مشاہیر کے خطوط ص ۱۸۹، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۱۹۹۲ء

(۴) انقلاب الامم دیباچہ ص ۱۔۲

(۵) تاریخ الحرمین الشریفین ص ۱۸۴،صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی، پنڈی بہاءالدین پنجاب،۱۹۲۲ء

(۶) تاریخ الحرمین الشریفین ص ۵

(۷) مولانا عبدالسلام ندوی ص ۵۲، ساہتیہ اکادمی، دہلی ۲۰۰۵ء

مقالات رمقدمے رتبصرے

مولانا عبدالسلام ندوی جس طرح ایک بڑے مصنف اور ایک بڑے مترجم تھے، اسی طرح ایک بڑے مقالہ نگار بھی تھے۔ یہی نہیں مقالہ نگاری کے فن پر ان کی مشاقانہ نظر تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان کی اس خوبی کے بڑے مداح تھے۔ ایک خط میں مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ

> ''آپ ہمارے مولوی عبدالسلام کے حسن اخذ، ترتیب وتزئین مطالب کا سلیقہ دیکھتے ہیں؟ صرف بغدادی کی ایک کتاب الفرق سے ایک اچھا خاصا مضمون لکھ لیا۔ چونکہ اس میں بعض تفصیلات نئی ملتی ہیں، اس لئے ہمیشہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اس پر ریویو کیا جائے لیکن مولوی عبدالسلام نے ایک مستقل مضمون تیار کرلیا۔''(۱)

مولانا نے مختلف موضوعات پر سیکڑوں علمی، تحقیقی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، تعلیمی، فلسفیانہ وکلامی اور قرآنی مضامین ومقالات سپرد قلم کئے جو ماہنامہ الندوہ لکھنؤ، الہلال کلکتہ، ثقافت اسلامیہ لاہور اور ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کی فائلوں میں محفوظ ہیں۔ (۲) ماہنامہ معارف کے صفحات میں ان سے زیادہ کسی کے مقالات اب تک شائع نہیں ہوئے۔ باوجود اس کے پروفیسر نورالحسن نقوی نے تاریخ ادب اردو میں جہاں مقالہ نگاروں کا ذکر کیا ہے وہاں مولانا کا نام تک نہیں لیا ہے۔

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی کے ادبی، تنقیدی اور تبصراتی مضامین ومقالات کا ایک مجموعہ ''مقالات عبدالسلام'' کے نام سے دارالمصنّفین نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا ہے۔ جس میں شعروادب سے متعلق ان کے بیشتر مضامین آگئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا شعروادب کے متنوع

موضوعات پر نگاہ و دسترس رکھتے تھے۔ مختلف شعراء کے دواوین پر انہوں نے جو نقد و تبصرہ کیا ہے، اس سے خود ان کے ادبی و تنقیدی شعور اور عالمانہ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اردو شاعری میں انقلاب کے جو اسباب بیان کئے ہیں اور دلی و لکھنو کی شاعری کے ایک دوسرے پر اثرات کی جو نشاندہی کی ہے وہ ان کے وسیع و عمیق مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ اردو شاعری اور فن تنقید ان کا اہم مضمون بھی اسی مجموعہ مقالات میں شامل ہے جو اپنی افادیت اور قدر و قیمت کے لحاظ سے خود ایک تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح شاعری بطور پیشہ کے اور مشاعرہ وغیرہ موضوعات و مضامین پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے بعد میں شاید ہی اس میں اضافہ ہوا ہو۔ اس مجموعہ میں جو مضامین و مقالات شامل ہیں ان کی فہرست یہ ہے:

مقالات عبدالسلام کے علاوہ انہوں نے جن دوسرے موضوعات پر مقالات سپرد قلم کئے ہیں اور جنہیں افادیت اور ضخامت کے پیش نظر کتابی صورت میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ان کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ آئندہ مولانا کے مضامین ومقالات کی ترتیب وتدوین کا جو منصوبہ بنے اس میں آسانی اور سہولت ہو اور ان کے موضوعات کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔

ا۔تحریم سود کے علل واسباب

مولانا عبدالسلام ندوی کی فقہ پر گہری نظر تھی۔اس موضوع پر ایک مستقل لکھنے کے علاوہ ایک کتاب کا ترجمہ کیا۔اس کے علاوہ انہوں نے متعدد مضامین بھی لکھے۔القضانی الاسلام اس سلسلے کی ان کی ایک اہم کاوش ہے۔ان کے فقہی مضامین میں ''تحریم سود کے علل واسباب'' سب سے اہم اور معرکہ آراء ہے۔یہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں چار قسطوں جون تا ستمبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا ہے۔اس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں حرمت سود کے اسباب وعلل مولانا نے تفصیل سے لکھے ہیں۔اپنے موضوع پر آج بھی یہ بے حد اہم اور مطالعہ واستفادہ کے لائق ہے۔

۲۔عمارات اسلام

تاریخ اسلام کی متعد یادگاروں اور عظیم الشان صناعیوں کی داد مولانا نے اپنے مختلف مضامین میں دی ہے۔ یہ مضمون بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے عمارات اسلام کی تاریخ ہے۔ جولائی ۱۹۱۶ء سے اکتوبر ۱۹۱۶ء تک کے معارف میں اس کی چار قسطیں مسلسل شائع ہوئی ہیں۔

۳۔مشرقی کتب خانے

مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنے کئی مضامین میں کتب خانوں کی بناوتاسیس، ان کی کتابوں ،نوادرات اور مخطوطات وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔اب ان مضامین کو جناب شمیم طارق صاحب نے گراں قدر مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے، اس کی اشاعت کا سہرا مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی کے سربراہ جناب محمد ہارون اعظمی کے سر ہے۔

۴۔اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے

عام مورخوں کی طرح ہندوستان کے مورخین نے بھی سیاسی تاریخ کی تدوین پر ساری توجہ مرکوز رکھی اور تہذیبی وتمدنی تاریخ کا پورے طور پر حق ادانہیں کیا۔یہی وجہ ہے ہماری تاریخوں میں جنگ وجدل کے واقعات اور معرکہ آرائیوں کی داستانیں تو ہیں مگر تہذیبی وثقافتی تاریخ کے واقعات بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔اس لئے اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر دارالمصنّفین نے ہندوستان کی تہذیبی وتمدنی تاریخ کی تدوین کی طرف توجہ دی۔اس سلسلہ کی تکمیل کی ذمہ داری مولانا عبدالسلام ندوی کے سپرد ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے نہایت تلاش وتفحص اور تحقیق وتدقیق کے ساتھ اس سلسلہ کے کئی مضامین لکھے۔ جو معارف اعظم گڑھ [اگست تا نومبر ۱۹۴۹ء] میں چار قسطوں میں شائع ہوئے۔اس میں مسلمان حکمرانوں کے عہد کے رفاہ عام کے کام، نئے قصبے، شہر اور گاؤں، باغات، ترقی حیوانات اور ترقی تعلیم وغیرہ کی تفصیلات ہیں جس سے مسلمان حکمرانوں

کے عہد کے تمدن کی ایک تصویر سامنے آجاتی ہے۔

اس کا کچھ حصہ مسودہ کی شکل میں بھی ہے۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ان مضامین کو ہندوستان کے ''مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے'' میں گو شائع کر دیا ہے تاہم اسے کتابی صورت میں مولانا عبدالسلام ندوی کے نام سے علاحدہ شائع کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔

۵۔اسلام اور نصرانیت کی کشمکش روس میں

اسلام اور نصرانیت کے موضوع سے مولانا عبدالسلام ندوی کی دلچسپی کا اندازہ ان کے اس سلسلہ کے مختلف مضامین سے ہوتا ہے۔انہوں نے اس موضوع پر متعدد مضامین لکھے۔ مذکورہ عنوان سے مولانا نے پانچ قسطوں [اپریل تا ستمبر ۱۹۱۸ء] میں معارف میں مضمون لکھا، جس سے روس میں نصرانیوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے ساتھ صلیبی جنگوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے عنوان سے بھی انہوں نے معارف کی دو قسطوں [فروری، مارچ ۱۹۲۳ء] میں مضمون لکھا۔اس طرح کے مولانا کے تمام مضامین جمع کر کے ایک جلد شائع کی جا سکتی ہے۔راقم نے ان تمام مضامین کو یکجا کر کے مقدمہ و کتابیات کے ساتھ کتابی صورت میں ''اسلام اور عیسائیت'' کے نام سے مرتب کر دیا ہے۔خدا کرے اس کی اشاعت کا سامان ہو جائے۔

۶۔مسلمانان روس

روس کے مسلمانوں کے حالات سے اس زمانہ میں کم واقفیت تھی۔چنانچہ مولانا نے مذکورہ عنوان سے ماہنامہ معارف میں چار قسطوں [جولائی تا ستمبر ۱۹۱۸ء] میں مضمون لکھا۔اس سے روس کے مسلمانوں کی علمی و تعلیمی صورت حال کے ساتھ ان کی حالت زار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

۷۔تصوف کی اجمالی تاریخ

اس میں مولانا نے تصوف کی اجمالی تاریخ اور اس کے ارتقا اور بعض خصوصیات وغیرہ کو قلم بند کیا ہے۔ یہ سلسلۂ مضامین معارف میں چھ قسطوں میں اپریل تا اکتوبر ۱۹۳۵ء شائع ہوا

ہے۔ساتویں قسط جنوری ۱۹۴۶ء میں معارف ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں علوم وفنون پر تصوف کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔مولانا عبدالسلام ندوی تصوف کی ایک مفصل تاریخ لکھنا چاہتے تھے۔(۳) مگر دوسری مصروفیات نے اس کا موقع نہیں دیا اور اسے وہ پایہ تکمیل تک نہیں پہونچا سکے۔اب اس سلسلہ مضامین کو مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی نے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔

۸۔فلسفہ لیبان

مولانا عبدالسلام ندوی کو فلسفہ سے خاص دلچسپی تھی۔وہ اس کا گہرا شعور اور اس کے مباحث پر وسیع وعمیق نظر رکھتے تھے۔اس کا اندازہ ان کے ایک درجن سے زیادہ اہم فلسفیانہ مضامین اور بعض کتب سے لگایا جاسکتا ہے۔ان کے اس طویل مضمون کو تصنیف کی حیثیت حاصل ہے۔اس میں انہوں نے تفصیل سے لیبان اور اس کے افکار وخیالات کی وضاحت وتشریح کی ہے۔کتابی صورت میں اس کے طبع واشاعت سے یقیناً ایک اہم فلسفیانہ کتاب کا اردو میں اضافہ ہوگا۔

۹۔سوشلزم

سوشلزم سے متعلق مولانا کے کئی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ایک مضمون میں [معارف مئی ۱۹۲۷ء] سوشلزم کی مختلف حیثیتوں کی وضاحت کی ہے۔ایک دوسرے مضمون میں [جون ۱۹۲۷ء] سوشلزم کے مختلف نظریات اور سوشلسٹ قوموں کا ذکر کیا ہے۔اسی طرح ان کا ایک مضمون ''سوسیالسٹ سپاہی'' ہے۔[جولائی ۱۹۳۰ء] اور ''سوشلسٹ حکومت کے نتائج'' [معارف ستمبر ۱۹۲۷ء] بھی اس سلسلہ کا ایک مضمون ہے۔

۱۰۔اسلامی طب کی مختصر تاریخ

اس میں طب اسلامی کی اجمالی تاریخ مولانا نے نہایت تلاش وتفحص کے ساتھ لکھی ہے۔یہ گراں مایہ مقالہ جنوری فروری ۱۹۴۸ء کے معارف میں شائع ہوا ہے۔اس سے پہلے جون

۱۹۳۰ میں انہوں نے ایک مضمون ''تاریخ طب کے پوشیدہ اوراق'' کے عنوان سے لکھا تھا۔اس کو بھی شامل کر دیا جائے تو یہ ایک کتابچہ منظر عام پر آ سکتا ہے، جو یقیناً طب کی تاریخ پر ایک تحقیقی مقالہ ہوگا۔

۱۱۔مولانا کاتبی نیشا پوری

مولانا عبدالسلام ندوی نے صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ حدیث، بزرگان دین ،شعراءاور دوسرے شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے اہل علم وکمال کے تذکرے بھی وقتاً فوقتاً لکھے ہیں، جو ماہنامہ الندوہ اور ماہنامہ معارف میں شائع ہوئے ہیں۔اگران کو جمع کر دیا جائے تو ایک جلد تذکرہ کی بھی مرتب ہوسکتی ہے۔خاص طور سے مولانا کاتبی نیشا پوری کے حالات وسوانح اور ان کی شاعری پر جو طویل تنقیدی مضمون ماہنامہ معارف [جولائی تا ستمبر ۱۹۴۰ء] میں تین قسطوں میں شائع ہوا ہے۔اسے ضرور کتابی شکل دینی چاہئے۔اسے شعرالعجم کے ضمیمے کے طور پر بھی شائع کیا جاسکتا ہے کہ اصلاً یہ اسی کا حصہ ہے۔اب یہ مقالہ پروفیسر کبیر احمد جائسی کے مقدمہ کے ساتھ کتابی صورت میں مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن سے شائع ہوگیا ہے۔اسی طرح امام مسلم پر انہوں نے ماہنامہ الندوہ میں دو قسطوں میں جو مضمون لکھا ہے وہ بھی بہت اہم ہے۔

۱۲۔اقبال کا فلسفہ خودی

مولانا نے اقبال کامل جیسی معرکہ آرا کتاب لکھی جو علامہ اقبال کے حالات اور شاعری پر لکھی جانے والی چند اہم اور بنیادی کتابوں میں سے ایک ہے۔اس سلسلہ میں انہوں نے علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کا مفصل جائزہ لیا ہے۔جو ماہنامہ معارف کی نو طویل قسطوں میں پھیلا ہوا ہے۔اس کو علاحدہ کتابی شکل دی جاسکتی ہے۔

مذکورہ طویل اور اہم مضامین و مقالات کے علاوہ بھی سیکڑوں علمی ، ادبی اور تحقیقی مقالات ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے مضامین ومقالات ان کی مطبوعہ کتابوں سے مباحث کے تنوع اور ضخامت دونوں لحاظ سے کہیں زیادہ بہتر اور برتر ہیں۔

ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری[۱۹۴۲-۲۰۰۶ء] نے اپنے اشاریہ آثار عبدالسلام میں ان کے مقالات کی مکمل فہرست درج کی ہے۔ افادیت کے پیش نظر وہ یہاں درج کی جاتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ان کے مقدموں اور دیباچوں کا ذکر ضروری ہے۔

مقدمے

مولانا عبدالسلام ندوی کے فضل وکمال کا شہرہ پورے ملک میں بلند ہوا۔ خاص طور پر ادبی حلقوں میں انہیں بڑی عزت واحترام اور ان کے خیالات کو وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ متعدد اہل قلم نے اپنی کتابوں پر ان سے پیش لفظ اور دیباچے لکھوائے۔ راقم کو مطالعہ کے دوران ایسی پانچ کتابیں ملیں جن پر مولانا کے قلم سے تعارف وتقریظات ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ تجار عراق — مولانا ضمیر احمد قدسی، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۲۸ء
۲۔ حیرۃ الفقہ — قاضی عبدالرحمٰن حیرت، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۲۹ء
۳۔ بہار — الیاس احمد، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۳۴ء
۴۔ رہنمائے تاریخ اردو، حاجی محمد عبدالقادر، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۳۸ء
۵۔ انتخاب کلام کاتبی — سید وزارت علی

ان دیباچوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ملک کے دوسرے اہل قلم کی کتابوں کی طباعت واشاعت سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ تجار عراق کے دیباچے میں محمد عبدالشکور لاری نے لکھا ہے کہ:

> ''مجھ کو نہایت فخر ہے کہ فخر اسلام مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مورخ دارالمصنّفین اعظم گڑھ نے اس کتاب کی اصلاح وتہذیب میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا ہے اور اکثر جگہ آپ کا مضمون بھی جزو کتاب ہے۔ مولانائے ممدوح نے ایک مبسوط تقریظ بھی اس کتاب پر لکھی ہے جو شروع میں درج کی جاتی ہے۔''(۴)

یقیناًان کے علاوہ بھی مولانا کے قلم سے اردو مصنفین کی کتابوں پر دیباچے اور مقدمے شائع ہوئے ہوں گے، جن تک راقم کی رسائی نہ ہوسکی ہوگی۔اہل علم سے گذارش ہے کہ اگر انہیں اس سلسلے میں کسی کو معلومات دستیاب ہوں تو اس سے راقم کو مطلع فرمائیں گے۔

تبصرے

مولانا عبدالسلام ندوی کو کتابوں سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔انہوں نے متعدد کتابوں پر طویل تبصرے لکھے۔خاص طور پر اردو و فارسی شعرا کے مجموعہ کلام پر ان کے بیسیوں اہم نقد و تبصرے الندوہ اور معارف میں شائع ہوئے جنہیں بے حد پسند کیا گیا۔''مقالات عبدالسلام'' میں اس طرح کے متعدد تبصرے شامل ہیں۔

ماہنامہ معارف میں مطبوعات جدیدہ پر تعارف وتبصرہ کا آغاز مولانا سید سلیمان ندوی نے کیا۔ان کے بعد اس سلسلے کو مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا ریاست علی ندوی، مولانا مجیب اللہ ندوی اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی[۱۹۳۷-۲۰۰۸ء] نے مدۃ العمر جاری رکھا اور ہزاروں کتابوں کا تبصرہ لکھے۔مولانا عبدالسلام ندوی نے یہ کام مستقل طور پر تو انجام نہیں دیا مگر معارف کے کئی شماروں میں ان کے تبصرے شائع ہوئے ہیں۔افادیت کے پیش نظر یہاں ان کی فہرست درج کی جاتی ہے:

۱۔	درجات الیقین	۲۔	العقیدۃ الواسطیہ
۳۔	الوصیۃ الصغریٰ	۴۔	اردو کا جدید قاعدہ
۵۔	عوامل النحو	۶۔	علم الصرف
۷۔	حمایت اخلاق	۸۔	فقرائے اسلام
۹	سیرۃ غوث الاعظم (۵)	۱۰۔	ہمارے رسول، از خواجہ محمد عبدالحیٔ
۱۱۔	افادت سلیم۔وحید الدین سلیم	۱۲۔	فلسفۂ تصوف از حکیم عبدالقوی
۱۳۔	حیات ہمایوں از آغا محمد جعفر	۱۴۔	خلافت الامۃ فی العبادات، مترجمہ محمد عبدالرحیم (۶)

۱۵۔ آزادی، مترجمہ سعید انصاری ۱۶۔ عصر جدید، از بانکی پرشاد
۱۷۔ مثنوی رموز العارفین از میر حسن دہلوی ۱۸۔ آرسی از نثار حسن خاں
۱۹۔ دردِ زندگی از احسان دانش ۲۰۔ اختلافات مرزا، از محمد خاں
۲۱۔ الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموع، از حبیب الرحمٰن اعظمی ۲۲۔ تذکرہ قوم کونی، از عبدالحمید خاں
۲۳۔ تحفۂ سعدیہ، مرتبہ مرزا احمد نذیر عرشی (۷) ۲۴۔ جمہرۃ البلاغۃ از حمید الدین فراہی
۲۵۔ خاکسار تحریک از محمو منظور نعمانی ۲۶۔ مسلمان کیا کریں
۲۷۔ خیال آفریں دماغ، از عرش تیموری (۸)

مولانا عبدالسلام ندوی نے باقاعدگی سے تبصرے نہیں لکھے، شاید یہ ان کی دلچسپی کا میدان نہیں تھا۔ البتہ انہوں نے تسلسل کے ساتھ کثرت سے مضامین لکھے جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور اسی اہمیت کے سبب یہاں ان کی مکمل فہرست درج کی جاتی ہے:

۱۔	ابولہب	معارف، جنوری ۱۹۳۲ء	۶۴-۷۰
۲۔	اجتہادات نبویہ	معارف، اپریل ۱۹۲۵ء	۲۸۲-۲۸۷
۳۔	احسان عشق اور ضمیمہ احسان عشق	معارف، دسمبر ۱۹۳۰ء	۴۷۳-۴۷۴
۴۔	احمد ذکی بک اور قسطنطنیہ کے کتب خانے	الندوہ، مارچ ۱۹۱۰ء	۱۷-۱۹
۵۔	اخبار علمیہ	معارف، اپریل ۱۹۲۵ء	۲۹۶-۲۹۹
۶۔	اخبار علمیہ	معارف، مئی ۱۹۳۰ء	۳۸۸-۳۹۱
۷۔	اخبار علمیہ	معارف، جولائی ۱۹۳۰ء	۳۰۳-۳۰۶
۸۔	اخبار علمیہ	معارف، جولائی ۱۹۳۲ء	۶۰-۶۳
۹۔	اخبار علمیہ	معارف، اگست، ۱۹۳۲ء	۱۳۸-۱۴۱

۱۰۔ اخبار علمیہ	معارف، نومبر ۱۹۳۲ء	۳۸۵-۳۸۸
۱۱۔ اخبار علمیہ	معارف، مارچ ۱۹۳۳ء	۲۳۱-۲۳۴
۱۲۔ اخبار علمیہ	معارف، مئی ۱۹۳۳ء	۳۸۹-۳۹۲
۱۳۔ اخبار علمیہ	معارف، جولائی ۱۹۳۳ء	۶۳-۶۶
۱۴۔ اخبار علمیہ	معارف، اپریل ۱۹۳۵ء	۳۰۵-۳۰۸
۱۵۔ اخبار الحکماء، قفطی پر ریویو	الندوہ، فروری ۱۹۱۱ء	۵-۶
۱۶۔ اخوان الصفاء	معارف، فروری ۱۹۴۹ء	۸۵-۱۰۴
۱۷۔ اردو شاعری اور فن تنقید	[۱] معارف، مئی ۱۹۶۱ء	
"	[۲] معارف، جون ۱۹۶۱ء	
"	[۳] معارف، جولائی ۱۹۶۱ء	
۱۸۔ اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد	ادیب، علی گڑھ نومبر ۱۹۴۳	
۱۹۔ اردو شاعری میں انقلاب کیوں کر پیدا ہوا	معارف، جون ۱۹۵۳ء	۴۳۷-۴۵۴
" ,,	[۲] معارف، جولائی ۱۹۵۳ء	۲۰-۳۳
" ,,	[۳] معارف، اگست ۱۹۵۳ء	۱۲۴-۱۳۵
۲۰۔ اردو غزل۔ یوسف حسین خاں	معارف، مارچ ۱۹۵۴ء	۲۲۴-۲۳۴
۲۱۔ اسلام اور تکمیل اخلاق	معارف، مئی ۱۹۵۴ء	۳۷۳-۳۸۰
۲۲۔ اسلام اور عیسائیت	[۱] معارف، فروری ۱۹۲۳ء	۸۷-۹۹
"	[۲] معارف، مارچ ۱۹۲۳ء	۱۶۹-۱۷۹
۲۳۔ اسلام اور نصرانیت کی کشمکش روس میں	[۱] معارف، اپریل ۱۹۱۸ء	۱۷-۲۵
"	[۲] معارف، جولائی ۱۹۱۸ء	۱۷-۱۸
"	[۳] معارف، اگست ۱۹۱۸ء	۷۹-۸۴
۲۴۔ اسلام عیسائی ممالک میں	الندوہ، اپریل ۱۹۱۰ء	۲۹-۳۲
۲۵۔ اسلام کی تمدنی کامیابیاں	معارف، اپریل ۱۹۲۰ء	۲۶۹-۲۷۹

۲۶۔ اسلام میں جانوروں پر شفقت کی تعلیم		معارف، ستمبر ۱۹۵۲ء	۲۰۰-۲۰۷
۲۷۔ اسلام میں مختلف فرقوں کی نشو ونما اور اس کے اسباب وعلل	[۱]	معارف، اپریل ۱۹۱۹ء	۵۱۱-۵۳۱
"	[۲]	معارف، مئی ۱۹۱۹ء	۵۹۳-۶۰۰
۲۸۔ اسلام اور مغربی لباس وتمدن		معارف، نومبر ۱۹۲۹ء	۳۲۸-۳۴۵
۲۹۔ اسلامی اقتدار کا اثر یورپ کی صنعت پر		معارف، اپریل ۱۹۳۰ء	۲۴۵-۲۶۰
۳۰۔ اسلامی طب کی مختصر تاریخ		معارف، جنوری ۱۹۴۸ء	۱۵-۱۶
۳۱۔ اسلامی علوم وفنون اور یورپ		الندوہ، اپریل ۱۹۱۱ء	۱۳-۲۶
۳۲۔ اسلامی عمارتیں عہد امیہ میں		معارف، اکتوبر ۱۹۳۲ء	۳۰۱-۳۰۲
۳۳۔ اسلامی فن تعمیر		معارف، اگست ۱۹۳۳ء	۱۴۶-۱۴۸
۳۴۔ اسلامی ممالک کی تعلیمی صورت حال		الندوہ، جنوری ۱۹۴۰ء	۲۶-۲۹
۳۵۔ اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے	[۱]	معارف، اگست ۱۹۴۹ء	۱۰۴-۱۲۵
"	[۲]	معارف، ستمبر ۱۹۴۹ء	۱۶۵-۱۸۶
"	[۳]	معارف، اکتوبر ۱۹۴۹ء	۲۴۵-۲۶۲
"	[۴]	معارف، نومبر ۱۹۴۹ء	۳۴۸-۳۶۰
۳۶۔ اسلامی یتیم خانے		معارف، اگست ۱۹۱۷ء	۳۳-۳۹
۳۷۔ اشتراکیت اور فوضویت		معارف، جولائی ۱۹۲۷ء	۲۷-۳۷
۳۸۔ اشرف علی خاں فغاں		معارف، اپریل ۱۹۲۲ء	۲۶۶-۲۷۸
۳۹۔ اقبال کا فلسفہ خودی	[۱]	معارف، اپریل ۱۹۴۷ء	۲۴۵-۲۶۵
"	[۲]	معارف، مئی ۱۹۴۷ء	۳۴۷-۳۵۷
"	[۳]	معارف، جون ۱۹۴۷ء	۴۰۵-۴۱۶
"	[۴]	معارف، جولائی ۱۹۴۷ء	۵-۳
"	[۵]	معارف، اگست ۱۹۴۷ء	۸۵-۹۵

"	[۶] معارف، ستمبر ۱۹۴۷ء	۱۷۱-۱۶۵
"	[۷] معارف، اکتوبر ۱۹۴۷ء	۲۶۶-۲۵۶
"	[۸] معارف، نومبر ۱۹۴۷ء	۳۳۸-۳۲۵
۴۰۔ اقبال کے اخلاقی تصورات	معارف، جنوری ۱۹۴۹ء	۵۱-۲۷
۴۱۔ اکبر کا سنجیدہ کلام	معارف، جون ۱۹۱۷ء	۵۳-۴۴
" ,,	معارف، جولائی ۱۹۱۷ء	۵۰-۴۵
۴۲۔ الاعتصاب فی الاسلام	[۱] الہلال ۲۹ر جولائی ۱۹۱۴ء	۱۰۴-۱۰۲
"	[۲] الہلال، ۵ر اگست ۱۹۱۴ء	۱۲۳-۱۲۱
"	[۳] الہلال، ۱۲ر اگست ۱۹۱۴ء	۱۴۳-۱۴۲
"	[۴] الہلال، ۱۹ر اگست ۱۹۱۴ء	
"	[۵] الہلال، ۲۶ر اگست ۱۹۱۴	۱۷۳-۱۷۲
" " (فقع مطاعن وازالہ شکوک)	الہلال، ۹ر ستمبر ۱۹۱۴ء	۲۱۶-۲۱۵
۴۳۔ التربیۃ الاستقلالیہ	[۱] معارف، جنوری ۱۹۱۷ء	
"	[۲] معارف، فروری ۱۹۱۷ء	۴۱-۳۴
"	[۳] معارف، مارچ ۱۹۱۷ء	۴۰-۳۳
"	[۴] معارف، مئی ۱۹۱۷ء	۴۰-۳۳
"	[۵] معارف، جولائی ۱۹۱۷ء	۴۴-۳۳
۴۴۔ الحاد اور شاعری	معارف، اپریل ۱۹۲۸ء	۲۹۳-۲۸۳
۴۵۔ العرب قبل الاسلام	الندوہ، نومبر ۱۹۱۰ء	۲۶-۱۱
۴۶۔ القضا فی الاسلام	[۱] معارف، نومبر ۱۹۲۷ء	۳۴۵-۳۲۹
"	[۲] معارف، دسمبر ۱۹۲۷ء	۴۲۷-۴۱۰
"	[۳] معارف، جنوری ۱۹۲۸ء	۳۴-۲۰
"	[۴] معارف، فروری ۱۹۲۸ء	۱۰۰-۹۸

۴۷۔ امام رازی اوران کی تصانیف		معارف، دسمبر ۱۹۳۰ء	۴۵۳-۴۳۵
۴۸۔ امام رازی کا تنقید فلسفہ		معارف، ستمبر ۱۹۴۲ء	۱۸۰-۱۶۵
" ,,		معارف، اکتوبر ۱۹۴۲ء	۲۵۴-۲۴۵
۴۹۔ امام غزالی اور فلسفہ اخلاق		معارف، ستمبر ۱۹۲۶ء	۱۸۴-۱۶۸
۵۰۔ امام مسلم		الندوہ، دسمبر ۱۹۰۶ء	۳۲-۱۳
۵۱۔ اندلس کا دماغی ترکہ		معارف، جولائی ۱۹۴۲ء	۶۰-۵۶
۵۲۔ انقرہ		معارف، اپریل ۱۹۳۵ء	۳۰۴-۳۰۲
۵۳۔ ایران کا قدیم خط		الندوہ، نومبر ۱۹۰۶ء	۲۶-۹
۵۴۔ ایران کا بینک		معارف، جنوری ۱۹۳۳ء	۶۳-۶۱
۵۵۔ ایک جدید فلسفہ تاریخ		معارف، مارچ ۱۹۱۷ء	۶-۴
۵۶۔ ایک قدیم دکنی شعر		معارف، جولائی ۱۹۳۲ء	۴۸-۴۶
۵۷۔ باشویک اور مغرب		معارف، ستمبر ۱۹۲۶ء	۲۲۱-۲۱۸
۵۸۔ بدعت	[۱]	الندوہ، نومبر ۱۹۱۱ء	۱۴-۱
"	[۲]	الندوہ، دسمبر ۱۹۱۱ء	۲۳-۶
۵۹۔ بگڑا ہوا اسلام		معارف، ستمبر ۱۹۲۰ء	۲۱۵-۲۱۲
۶۰۔ بہارستان۔ظفر علی خاں		معارف، جنوری ۱۹۴۱ء	۷۵-۶۸
۶۱۔ پنجاب اور سندھ کے آثار قدیمہ		معارف، جون ۱۹۲۰ء	۴۲۲-۴۰۵
۶۲۔ تاتاری مسلمان اور عربی تعلیم		معارف، جنوری ۱۹۱۹ء	۳۷۶-۳۷۰
۶۳۔ تاریخ اخلاق یورپ		معارف، مارچ ۱۹۱۸ء	۵۲-۴۹
۶۴۔ تاریخ ادب اردو۔رام بابو سکسینہ		معارف، اپریل ۱۹۳۱ء	۳۱۳-۳۱۱
۶۵۔ تاریخ کے پوشیدہ اوراق		معارف، جون ۱۹۲۰ء	۴۲۲-۴۰۵
۶۶۔ تحریفات یہود		معارف، ستمبر ۱۹۱۷ء	۳۵-۲۶
۶۷۔ تحریم سود کے علل واسباب	[۱]	معارف، جون ۱۹۲۴ء	۴۴۳-۴۰۶

"	[٢]	معارف، جولائی ۱۹۲۴ء	۱۰-۳۱
"	[٣]	معارف، اگست ۱۹۲۴ء	۱۰۹-۱۲۸
"	[۴]	معارف، ستمبر ۱۹۲۴ء	۱۷۰-۱۸۴
٦٨۔ تذکرہ محسن۔ تبصرہ		معارف، نومبر ۱۹۳۵ء	۳۹۵-۳۹٦
٦٩۔ ترک جنگ عظیم میں کیوں شامل ہوئے		معارف، اپریل ۱۹۲۵ء	۲۸۸-۲۹۳
۷۰۔ تصوف کا اثر علوم وفنون پر		معارف، جنوری ۱۹۳٦ء	۲۵-۳۲
۷۱۔ تصوف کی اجمالی تاریخ	[۱]	معارف، اپریل ۱۹۳۵ء	۲۹۵-۲۷۴
"	[٢]	معارف، مئی ۱۹۳۵ء	۳٦۵-۳۷۱
"	[٣]	معارف، جون ۱۹۳۵ء	۴۴٦-۴۵۴
"	[۴]	معارف، اگست ۱۹۳۵ء	۱۱۱-۱۳۲
"	[۵]	معارف، ستمبر ۱۹۳۵ء	۲۱۲-۲۱۸
"	[٦]	معارف، اکتوبر ۱۹۳۵ء	۲۷۲-۲۸۲
۷۲۔ تصوف کی تجدید واصلاح		معارف، مارچ ۱۹۳۸ء	۱۸۵-۱۹۳
۷۳۔ تطبیق مذہب وسائنس		الندوہ، جون ۱۹۱۰ء	۳-۱۸
۷۴۔ تعدد ازدواج		ثقافت، لاہور	
۷۵۔ تناسخ		الندوہ، مئی ۱۹۰٦ء	۳۱-۳۲
۷٦۔ جام صہبائی		معارف، جون ۱۹۳۰ء	۴۷۴-۴۷۷
۷۷۔ جامعہ ازہر		معارف، جنوری ۱۹۳۲ء	۵۴-۵۹
۷۸۔ جدید معلومات قدیم کتابوں میں		الندوہ، ستمبر ۱۹۱۰ء	۱۱-
۷۹۔ جنگ اور اخلاق		معارف، ستمبر ۱۹۱٦ء	۴۳-۴۷
۸۰۔ جواہر سخن		معارف، مئی ۱۹۳۴ء	۳۹۱-۳۹۷
۸۱۔ جہان آرزو۔ آرزو لکھنوی		معارف، فروری ۱۹۳۷ء	۱۵۲-۱۵۵
۸۲۔ حاضر المصریین		معارف، مئی ۱۹۱۸ء	۱۹-۳۱

۸۳۔ حالات ندوہ	الندوہ، جنوری ۱۹۱۰ء	۳۲-۲۹
۸۴۔ حجۃ الاسلام۔ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی	معارف، نومبر ۱۹۲۵ء	۳۹۷-۳۹۵
۸۵۔ حضرت سلمان فارسی	[۱] الندوہ، اکتوبر ۱۹۱۰ء	۱۱-۳
"	[۲] البلاغ کلکتہ ۲۵ فروری ۱۹۱۶	۱۷-۱۶
"	[۳] البلاغ ۳-۱۰/ مارچ ۱۹۱۶ء	۲۳-۲۲
۸۶۔ حضرت شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری	معارف، جنوری ۱۹۲۶ء	۷۷-۷۲
۸۷۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ	الندوہ، ستمبر ۱۹۱۰ء	۲۶-۲۴
۸۸۔ حقیقت اور مصالح	معارف، مئی ۱۹۴۶ء	۴۲۱-۴۱۲
۸۹۔ حکمائے اسلام کا اخلاق	[۱] معارف، مئی ۱۹۴۶ء	۳۳۸-۳۳۵
"	[۲] معارف، جون ۱۹۴۶ء	۴۳۷-۴۲۳
"	[۳] معارف، جولائی ۱۹۴۶ء	۳۶-۲۴
"	[۴] معارف، ستمبر ۱۹۴۶ء	۱۷۴-۱۶۵
۹۰۔ خصائص قرآن مجید	معارف، جون ۱۹۳۲ء	۴۲۷-۴۰۵
۹۱۔ خطاب العرب	[۱] معارف، اگست ۱۹۱۸ء	۹۳-۸۵
"	[۲] معارف، ستمبر ۱۹۱۸ء	۱۵۷-۱۴۸
۹۲۔ خطبہ صدارت، انجمن ادبیہ کان پور	معارف، جنوری ۱۹۴۲ء	۴۳-۲۷
۹۳۔ خطبہ صدارت مشاعرہ اعظم گڑھ	معارف، اپریل ۱۹۴۲ء	۲۸-۱۸
۹۴۔ خلفائے بنو امیہ اور اشاعت اسلام	معارف، نومبر ۱۹۱۸ء	۲۴۳-۲۳۷
۹۵۔ خلفائے عباسیہ اور فریضہ اشاعت اسلام	معارف، نومبر ۱۹۱۶ء	۳۲-۲۵
۹۶۔ خواجہ حسن دہلوی	معارف، دسمبر ۱۹۳۴ء	۴۵۰-۴۴۲
۹۷۔ خوش قسمت حافظ اور بدقسمت خیام	معارف، نومبر ۱۹۲۰ء	۳۴۳-۳۳۱
۹۸۔ دارالتصنیف کابل	معارف، نومبر ۱۹۳۲ء	۳۸۱-۳۷۷

۹۹۔ دلی اورلکھنو کی شاعری کااثرایک دوسرے پر		معارف،جون۱۹۵۶ء	۴۴۶-۴۶۱
"	[۲]	معارف،جولائی۱۹۵۶ء	۴۳-۵۹
"	[۳]	معارف،اگست۱۹۵۶ء	۱۱۵-۱۳۶
"	[۴]	معارف،ستمبر۱۹۵۶ء	۱۸۹-۲۰۲
۱۰۰۔ دین حنیف		معارف،جولائی۱۹۲۰ء	۵۱-۵۶
۱۰۱۔ دیوان حسرت موہانی		معارف،مارچ۱۹۱۷ء	۲۸-۳۷
۱۰۲۔ رباعیات سحابی		معارف،ستمبر۱۹۳۲ء	۲۲۹-۲۳۵
۱۰۳۔ روح الاجتماع		الندوہ،مارچ۱۹۱۱ء	۶-۲۴
۱۰۴۔ روح تنقید۔تبصرہ		معارف،فروری۱۹۲۶ء	۱۵۴-۱۵۶
۱۰۵۔ رہبانیت اوراسلام	[۱]	معارف،دسمبر۱۹۳۳ء	۴۲۵-۴۴۰
"	[۲]	معارف،جنوری۱۹۳۴ء	۲۱-۳۴
"	[۳]	الندوہ،اپریل۱۹۰۹ء	۲۵-۳۳
۱۰۶۔ ریویوشعرالعجم		الندوہ،جنوری۱۹۱۰ء	۸-۱۱
۱۰۷۔ زکوٰۃ		الندوہ،اکتوبر۱۹۰۸ء	۴-۱۵
۱۰۸۔ سلاطین ممالک مصرکاچترشاہی		معارف،اگست۱۹۳۲ء	۲۳۵-۲۳۷
۱۰۹۔ سلطنت روس اور مذہبی مداخلت		الندوہ لکھنؤ،دسمبر۱۹۱۰ء	۹-۱۰
۱۱۰۔ سورۂ قیامہ کے چندنکات (مولانا حمیدالدین فراہی کے مضمون کاترجمہ)		معارف،جنوری۱۹۲۱ء	۶-۵۱
۱۱۱۔ سوشیالزم کی مختلف حیثیتیں اوراس کی اشاعت کے اسباب		معارف،مئی۱۹۲۷ء	۳۵۸-۳۸۳
" ,,		معارف،جون۱۹۲۷ء	۴۳۷-۴۴۲
" ,,		معارف،جولائی۱۹۲۷ء	۴۱-۴۹

۱۱۲۔ سوشیالسٹ سپاہی	معارف، جولائی ۱۹۳۰ء	۴۹-۶۰
۱۱۳۔ شاعری بطور پیشے کے	معارف، مئی ۱۹۵۳ء	۳۴۱-۳۶۴
۱۱۴۔ شبلی کا طرز تحریر	ادیب۔ علی گڑھ، شبلی نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء	۱۸۶-۱۹۲
۱۱۵۔ شبلی کی فارسی شاعری	ادیب علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء	۱۴۱-۱۴۸
۱۱۶۔ شذرات	الندوہ، مئی ۱۹۱۱ء	۱-۲
۱۱۷۔ شذرات	معارف، فروری ۱۹۲۵ء	۲-۵
۱۱۸۔ شذرات	معارف، مئی ۱۹۲۶ء	۳۲۶-۳۲۹
۱۱۹۔ شرحِ دیوان مومن۔ مولفہ ضیاء احمد بدایونی	معارف، ستمبر ۱۹۳۵ء	۲۳۵-۲۳۷
۱۲۰۔ شفق۔ شفیق جونپوری	معارف، مئی ۱۹۴۶ء	۳۷۴-۳۹۷
۱۲۱۔ شکریۂ معذرت	الندوہ، اپریل ۱۹۱۰ء	۳۲
۱۲۲۔ شمیم عشرت	معارف، دسمبر ۱۹۴۲ء	۴۷۴-۴۷۶
۱۲۳۔ شیخ شہاب الدین سہروردی	الندوہ، جولائی ۱۹۰۶ء	۱-۲۰
۱۲۴۔ شیخ مصحفی کا تذکرہ ندوہ کے کتب خانے میں	معارف، اگست ۱۹۲۳ء	۸۹-۱۱۲
۱۲۵۔ شیریں فرہاد	معارف، اگست ۱۹۲۸ء	۱۱۶-۱۲۱
۱۲۶۔ صحیح مسلم	الندوہ، جنوری ۱۹۰۷ء	۲۸-۳۲
" ,,	الندوہ، فروری ۱۹۰۷ء	۲۰-۲۷
۱۲۷۔ صوفیانہ نظام اخلاق	معارف، اکتوبر ۱۹۳۷ء	۲۴۵-۲۵۴
" ,,	معارف، نومبر ۱۹۳۷ء	۳۵۰-۳۵۸
۱۲۸۔ طلاق عیسائی مذہب میں	معارف، مارچ ۱۹۲۲ء	۱۹۰-۲۰۳

۱۲۹۔ عربوں کی جہاز رانی ، مولانا سید سلیمان ندوی	معارف، نومبر ۱۹۳۵ء	۳۹۲-۳۹۴
۱۳۰۔ عربی نظم ونثر کی تاریخ	معارف، دسمبر ۱۹۴۹ء	۴۳۰-۴۵۰
"	معارف، جنوری ۱۹۵۰ء	۲۴-۴۲
"	معارف، فروری ۱۹۵۰ء	۱۲۵-۱۳۶
۱۳۱۔ عرش ملسیانی کی شاعری۔ تعارف کبیر احمد جائسی	نگار، مئی ۱۹۶۰ء	۳۲-۴۱
۱۳۲۔ عقیقہ اوراس کے مصالح	معارف، جون ۱۹۲۶ء	۴۱۲-۴۲۱
۱۳۳۔ علماء کا آغاز تنزل آٹھویں صدی میں	معارف، جولائی ۱۹۲۸ء	۱۲-۱۶
۱۳۴۔ علمائے اسلام کا اخلاق	معارف، مئی ۱۹۴۶ء	۳۲۵-۳۴۸
"	معارف، جون ۱۹۴۶ء	۴۲۳-۴۲۷
"	معارف، جولائی ۱۹۴۶ء	۲۴-۳۶
"	معارف، ستمبر ۱۹۴۶ء	۱۶۵-۱۷۶
۱۳۵۔ علمی خبریں	الندوہ، جون ۱۹۱۰ء	۳۱-۳۲
۱۳۶۔ ,,	اگست ۱۹۱۰ء	۳۲
۱۳۷۔ ,,	ستمبر ۱۹۱۰ء	۲۲-۲۹
۱۳۸۔ علوم اسلامیہ اوراٹلی	دسمبر ۱۹۱۰ء	۱-۲
۱۳۹۔ عمارات اسلامی۔ مسجد نبویؐ	[۱] معارف، جولائی ۱۹۱۶ء	۱۹-۲۵
"	[۲] معارف، ستمبر ۱۹۱۶ء	۱۷-۲۴
"	[۳] معارف، اکتوبر ۱۹۱۶ء	۱۷-۲۲
۱۴۰۔ عہد نبوی کی دو علامات قبر	معارف، اکتوبر ۱۹۳۳ء	۳۰۶-۳۰۹
۱۴۱۔ عیسائی مذہب کی تمدنی ناکامیاں	معارف، اپریل ۱۹۲۰ء	۲۶۹-۲۷۹

۱۴۲۔ فرانسیسی شاعری اوراس عربی ادب کے اثرات	معارف، جنوری ۱۹۳۳ء	۵۷-۶۱
۱۴۳۔ فرق ضالہ اوراس کے فقہی مسائل	معارف، ستمبر ۱۹۲۱ء	۱۸۸-۱۹۴
۱۴۴۔ فرقہ شعوبیہ	الندوہ، مارچ ۱۹۱۱ء	۲۵-۳۲
۱۴۵۔ فرقہ مرجیہ	معارف، اگست ۱۹۳۰ء	۱۴۰-۱۴۲
۱۴۶۔ فطرت اسلام میں یورپ کا مذہبی تعصب	الندوہ، جولائی ۱۹۱۰ء	۳۰-۳۱
۱۴۷۔ فلسفۂ اشراق اوراسلام	معارف، جولائی ۱۹۴۴ء	۵-۹
۱۴۸۔ فلسفۂ اشراق اوراسلام	معارف، اگست ۱۹۴۴ء	۱۰۳-۱۲۴
۱۴۹۔ فلسفۂ البلاغت	معارف، جون ۱۹۵۱ء	۴۳۶-۴۵۰
۱۵۰۔ فلسفۂ انبساط	معارف، دسمبر ۱۹۳۰ء	۴۷۴-۴۷۷
۱۵۲۔ فلسفۂ جمال اوراس کا اثر تصوف پر	معارف، اگست ۱۹۲۰ء	۱۳۸-۱۴۰
۱۵۳۔ فلسفۂ شیخ الاشراق	الندوہ، مارچ ۱۹۱۰ء	۲۰-۲۵
۱۵۴۔ فلسفۂ لیبان	[۱] معارف، دسمبر ۱۹۱۷ء	۳۳-۴۷
"	[۲] معارف، اکتوبر ۱۹۱۸ء	۲۰۶-۲۱۴
"	[۳] معارف، نومبر ۱۹۱۸ء	۲۶۵-۲۷۴
"	[۴] معارف، جنوری ۱۹۱۹ء	۳۶۳-۳۶۹
"	[۵] معارف، فروری ۱۹۱۹ء	۴۲۵-۴۳۲
"	[۶] معارف، اکتوبر ۱۹۱۹ء	۲۷۸-۲۸۵
"	[۷] معارف، نومبر ۱۹۱۹ء	۳۵۹-۳۶۷
۱۵۵۔ فن تراجم وطبقات	معارف، جنوری ۱۹۱۷ء	۳۷-۴۰
۱۵۶۔ فیلالوجی اوراسلام	الندوہ، ستمبر ۱۹۰۹ء	۲۰-۳۳
۱۵۷۔ قدیم عربی مدارس کی اصلاح ٹرکی میں	الندوہ، جولائی ۱۹۱۰ء	۱۸-۲۳

۱۵۸۔ قدیم وجدید شعراء اوران کی شاعری پرایک مبسوط نظر	[۱]	معارف، جنوری ۱۹۵۸ء	۴۶-۶۱
"	[۲]	معارف، فروری ۱۹۵۸ء	۱۳۰-۱۴۰
"	[۳]	معارف، مارچ ۱۹۵۸ء	۱۸۵-۲۰۳
"	[۴]	معارف، اپریل ۱۹۵۸ء	۲۶۲-۲۷۴
۱۵۹۔ قرآن مجیداور شاعری		معارف، جون ۱۹۲۰ء	۴۲۸-۴۴۳
۱۶۰۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب		معارف، مئی ۱۹۳۳ء	۳۹۵-۳۹۶
۱۶۱۔ قصص الانبیاء اور قرآن مجید		الندوہ، ستمبر ۱۹۱۰ء	۳-۱۱
۱۶۲۔ قصۂ آدم وحوا کی اثری تائید		معارف، جون ۱۹۳۳ء	۴۶۴-۴۶۷
۱۶۳۔ کلمات الشعرائے سرخوش		معارف، مارچ ۱۹۴۳ء	۲۳۲-۲۳۵
۱۶۴۔ کلیات اقبال (تبصرہ)		معارف، جون ۱۹۲۶ء	۴۷۵-۴۷۷
۱۶۵۔ کلیات حسن دہلوی (تبصرہ)		معارف، اکتوبر ۱۹۳۴ء	۳۰۱-۳۱۲
۱۶۶۔ کلیات عزیز (تبصرہ)		معارف، اپریل ۱۹۳۲ء	۷۹-۱۱۶
۱۶۷۔ کیا اجتماع انسانی ترقی کررہا ہے		معارف، نومبر ۱۹۱۷ء	۳۰-۴۰
۱۶۸۔ کیا علم جدید پر سلطنت کا اثر پڑا ہے		معارف، نومبر ۱۹۳۴ء	۳۲۵-۳۴۲
۱۶۹۔ کیا قرآن شریف ایک مسجع کلام ہے		معارف، جنوری ۱۹۳۵ء	۴۶-۵۱
۱۷۰۔ گاندھی اور فورڈ		معارف، ۱۹۲۵ء	۲۹۳-۲۹۵
۱۷۱۔ گلبانگ۔ مجموعۂ کلام حافظ شمس الدین		معارف، ۱۹۵۳ء	۲۲۰-۲۲۳
۱۷۲۔ گیٹسے (GETSE) اوراس کی صد سالہ برسی		معارف، جون ۱۹۳۲ء	۴۲۴-۴۷۰
۱۷۳۔ مآثر صدیقی، مؤلفہ نواب علی حسن خاں		معارف، فروری ۱۹۲۶ء	۱۵۲-۱۵۴
۱۷۴۔ مثنوی خواب وخیال، خواجہ میر اثر دہلوی		معارف، اکتوبر ۱۹۱۷ء	۳۸-۴۰
۱۷۵۔ محدثین کا اخلاق	[۱]	معارف، مارچ ۱۹۱۷ء	۷-۱۶

"	[۲]	معارف، اپریل ۱۹۱۷ء	۳۶-۴۰
۱۷۶۔ مذہب اور عقل		الندوہ، اکتوبر ۱۹۱۰ء	۱۲-۲۵
۱۷۷۔ مرأۃ الشعر جلد دوم۔ مؤلفہ محمد یحییٰ تنہا		معارف، اپریل ۱۹۵۱ء	۳۰۹-۳۱۶
۱۷۸۔ مراۃ المثنوی		معارف، جولائی ۱۹۳۴ء	۶۳-۶۵
۱۷۹۔ مراسلہ۔ کتاب مفتوح، بنام ایڈیٹر الہلال		الہلال، ۸/ جولائی ۱۹۱۴ء	۱۷-۱۸
۱۸۰۔ مسلمان اور فن شیشہ سازی		معارف، جولائی ۱۹۳۲ء	۵-۵۹
۱۸۱۔ مسلمانان روس	[۱]	معارف، ستمبر ۱۹۱۸ء	۱۴۴-۱۴۷
"	[۲]	معارف، جولائی ۱۹۱۸ء	۱۷-۲۴
"	[۳]	معارف، اگست ۱۹۱۸ء	۷۹-۸۴
۱۸۲۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کی مودت۔ مشہور متکلم جاحظ کے نقطۂ نظر سے		معارف، جولائی ۱۹۲۸ء	۳۴۷-۳۸۱
۱۸۳۔ مسلمانوں کی جغرافیائی تحقیقات		الندوہ، مئی ۱۹۱۰ء	۱۵-۳۳
۱۸۴۔ مسلمانوں کی علمی تاریخ		الندوہ، جنوری ۱۹۱۱ء	۱۳-۳۳
۱۸۵۔ مسلمانوں کے تنزل کی داستان		معارف، جنوری ۱۹۲۵ء	۹-۲۵
۱۸۶۔ مسلمانوں کے چند مخصوص اوقات: نامور کارِ خیر		معارف، اکتوبر ۱۹۳۴ء	۲۷۷-۲۸۰
۱۸۷۔ مسئلۂ ارتقا اور حکمائے اسلام	[۱]	الندوہ، اکتوبر ۱۹۱۱ء	۲۴-۳۲
"	[۲]	الندوہ، اکتوبر ۱۹۱۱ء	۳۶-۳۸
۱۸۸۔ مسئلہ اصلاح تعلیم	[۱]	معارف، اپریل ۱۹۴۰ء	۲۶۳-۲۸۲
"	[۲]	معارف، مئی ۱۹۴۰ء	۳۵۳-۳۷۳
"	[۳]	معارف، جون ۱۹۴۰ء	۴۳۹-۴۵۴
۱۸۹۔ مسئلہ خلافت کے متعلق ایک قدیم جدوجہد		معارف، اگست ۱۹۲۰ء	۱۱۳

۱۹۰۔ مسئلہ وحدت الوجود کے متعلق اکابر اسلام کے خیالات		معارف، دسمبر ۱۹۲۲ء	۴۰۸-۴۲۱
۱۹۱۔ مشاعرہ		معارف، اپریل ۱۹۳۳ء	۲۸۸-۲۹۸
۱۹۲۔ مشرقی کتب خانے	[۱]	معارف، جون ۱۹۱۹ء	۳۶-۴۷
"	[۲]	معارف، اگست ۱۹۱۹ء	۱۱۰-۱۱۹
"	[۳]	معارف، ستمبر ۱۹۱۹ء	۲۰۰-۲۰۸
۱۹۳۔ مصر کے سکے		معارف، نومبر ۱۹۳۲ء	۳۸۲-۳۸۴
۱۹۴۔ معتزلہ اپنی اصل شکل میں		معارف، ستمبر ۱۹۲۸ء	۱۶۸-۱۸۷
۱۹۵۔ معجزات اور اسباب خفیہ		معارف، مئی ۱۹۲۳ء	۳۲۹-۳۳۶
۱۹۶۔ معجزۂ قرآن کی نوعیت		معارف، اکتوبر ۱۹۵۰ء	۲۴۵-۲۶۲
۱۹۷۔ معجزۂ قرآن کی نوعیت		معارف، نومبر ۱۹۵۰ء	۳۳۵-۳۳۶
۱۹۸۔ معجم البلدان اور یاقوت حموی		معارف، اکتوبر ۱۹۳۰ء	۲۵۰-۲۷۳
۱۹۹۔ معیار تاویل		معارف، نومبر ۱۹۲۷ء	۲۵۳-۲۵۸
۲۰۰۔ موادِ شعر		معارف، جون ۱۹۵۴ء	۴۵۲-۴۶۰
۲۰۱۔ موصل اور یہاں کا فرقۂ یزیدیہ		معارف، دسمبر ۱۹۳۴ء	۴۶۲-۴۶۵
۲۰۲۔ مولانا کاتبی نیشاپوری	[۱]	معارف، جولائی ۱۹۴۰ء	۲۳-۳۸
"	[۲]	معارف، اگست ۱۹۴۰ء	۱۰۵-۱۱۷
"	[۳]	معارف، ستمبر ۱۹۲۶ء	۱۸۴-۱۹۳
۲۰۳۔ مہندسین اسلام		معارف، مئی ۱۹۲۶ء	۳۳۰-۳۳۸
۲۰۴۔ نغمۂ دل، جناب دل شاہ جہاں پوری		معارف، جنوری ۱۹۳۳ء	۷۰-۷۵
۲۰۵۔ نواب عماد الملک سید حسن بلگرامی		معارف، جون ۱۹۲۶ء	۴۰۸-۴۱۱
۲۰۶۔ نوائے بیدل		معارف، جنوری ۱۹۵۲ء	۷۲-۷۶
۲۰۷۔ وادیِ عقیق (تمدن اسلام کا آغاز)		معارف، مارچ ۱۹۲۵ء	۱۶۳-۱۸۳

۲۰۸۔ واعظ اردو شاعری میں، شعر الہند	معارف، دسمبر ۱۹۱۹ء	
۲۰۹۔ وصف شہید یا شہادہ	معارف، اگست ۱۹۴۲ء	۵۸-۱۰۲
۲۱۰۔ وقارِ حیات	معارف، اگست ۱۹۲۶ء	۱۵۴-۱۵۷
۲۱۱۔ ہذا فراق بینی اور بینک	الہلال، ۶/اگست ۱۹۱۳ء	۱۸-۱۹
۲۱۲۔ یادگارِ انیس	معارف، اپریل ۱۹۲۶ء	۳۱۵-۳۱۷
۲۱۳۔ یادگارِ سلف	الندوہ، جنوری ۱۹۱۱ء	۶-۱۲

مولانا عبدالسلام ندوی کے مضامین ومقالات کی اس طویل فہرست سے ان کی جامعیت بلکہ عبقریت کا پورے طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں علم وفن کے مختلف شعبوں میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ مذاہب، قرآنیات، احادیث وفقہ، سیرت وسوانح، تنقید، تاریخ وتذکرہ، تصوف وسلوک، فلسفہ وکلام وعقائد تعلیمات، طب اور ادب عربی وفارسی اور خاص طور سے اردو ادب وغیرہ مختلف موضوعات پر وہ یکساں نظر اور قدرت ومہارت رکھتے تھے اور ان تمام موضوعات پر ان کی تحریریں یادگار ہیں جو علم وفن کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ سچ ہے مولانا جیسی یگانہ روزگار شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

حواشی

(۱) ماہنامہ معارف نومبر ۱۹۳۵ء ص

(۲) ملاحظہ ہو راقم کا مضمون سہ ماہی فکر ونظر، اسلام آباد پاکستان، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۵ء

(۳) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۳۵ء ص/۲۵۹

(۴) تجار عراق ص ۴-۵

(۵) معارف، نومبر ۱۹۲۵ء ص ۳۹۸-۴۰۰

(۶) معارف، جولائی ۱۹۳۰ء ص ۷۸-۸۰

(۷) معارف، اگست ۱۹۳۵ء ص ۱۵۸-۱۶۰

(۸) معارف، جون ۱۹۴۱ء ص ۴۷۷-۴۸۰

شبلی کے علمی منصوبوں کی تکمیل

تحقیق وتدقیق اور تصنیف وتالیف کے لئے علامہ شبلی نے جو ہر قابل سمجھ کر جن ہونہار طلبہ کی تربیت اور رہنمائی کی، مولانا عبدالسلام ندوی اس کاروان علم وفن کے ایک اہم رکن تھے۔ صہبائے شبلی اوروں کے مقابلہ میں ان پر زیادہ اثر انداز ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں اس کا اثر بھی صاف نمایاں ہے۔

اسلام کی عظمت اور سر بلندی کے لئے علامہ شبلی نے متعدد علمی وعملی منصوبے بنائے، چونکہ انہیں مولانا عبدالسلام ندوی سے عزیزانہ تعلق تھا، اس لئے فطری طور پر علامہ شبلی کے علمی منصوبوں اور عزائم سے وہ زیادہ واقف ہوئے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے مولانا عبدالسلام ندوی ان کے علمی کاموں میں معاون اور سرگرم ہوئے اور پھر مدۃ العمر فکر شبلی سے سرشار رہے۔ پروفیسر محمود الٰہی نے سچ لکھا ہے کہ:

> ''علامہ شبلی نعمانی کی رفاقت جن دانشوروں کو نصیب ہوئی ان میں مولانا عبدالسلام ندوی کو کئی جہتوں سے اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے دارالمصنّفین کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ وہ فنا فی العلم تھے۔ عمر کے آخری حصے تک انھیں صرف اتنا ہوش رہتا تھا کہ جادۂ شبلی سے ان کا قدم ڈگمگانے نہ پائے۔(۱)

اس مختصر مقالے میں اسی جادۂ شبلی سے مولانا عبدالسلام ندوی کی گہری استواری اور مدۃ العمر گامزن رہنے کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

ماہنامہ الندوہ کا اجراء اور اس کے ذریعہ اسلام اور اسلامی علوم وفنون کی خدمت علامہ شبلی کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اسے بام عروج تک پہنچانے میں ان کے جن ممتاز تلامذہ نے حصہ لیا،

ان میں مولانا عبدالسلام ندوی کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے اسی رسالے سے مضمون نگاری کی ابتدا کی۔ مئی ۱۹۰۶ء میں پہلا مضمون تناسخ لکھا جسے علامہ شبلی نے اس قدر پسند کیا کہ تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی نے الندوہ میں متعدد علمی وادبی مضامین لکھے اور علامہ شبلی کا اس قدر اعتماد حاصل کرلیا کہ مارچ ۱۹۱۰ء میں اس کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ جولائی ۱۹۱۱ء تک وہ اس منصب پر فائز رہے۔ اس دوران انھوں نے مضامین کے علاوہ علمی خبریں، تبصرے اور شذرات تک لکھے، اہل علم سے مضامین کے لئے خط وکتابت کی (۲) اور متعدد اہم مضامین شائع کئے۔ غرض ہر طرح سے اپنے استاذ کے اس رسالے کو معیار ووقار عطا کرنے کی کوشش کی۔

یہی وہ دور ہے جب علامہ شبلی شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص وعقیدت کی نذر پیش کرنے کے لئے چمن کدوں سے روح پرور بہاروں کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس مقدس کام میں اپنے عزیز شاگرد کو بھی شامل کیا۔ لٹریری اسسٹنٹ بنایا۔ بمبئی کے سفر میں ساتھ رکھا۔ سیرۃ النبیؐ جلد دوم میں ازواج مطہرات کے حالات وسوانح کا حصہ مولانا عبدالسلام ندوی ہی کی کاوش ہے، جسے علامہ مرحوم نے اپنے لحاظ سے ترتیب دے کر شامل کیا ہے۔ (۳)

علامہ شبلی کی وفات (۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء) کے بعد سیرت نبویؐ کی تکمیل مولانا سید سلیمان ندوی کا عظیم الشان کارنامہ ہے، جس میں مولانا عبدالسلام ندوی کا بھی یک گونہ حصہ ہے۔ سید صاحب نے دیباچے میں اعتراف کیا ہے کہ احادیث اور واقعات سیرت کی تلاش وتحقیق میں مولانا عبدالسلام ندوی نے ان کی مدد کی۔ مولانا سعید انصاری کے مطابق سیرت کی تیسری جلد جو معجزات پر ہے تمام تر مولانا عبدالسلام ندویؒ کی کاوش ہے اور چھٹی جلد میں فضائل واخلاق کے بعض عنوانات بھی انھیں کے قلم کے ہیں۔ (۴) غرض علامہ شبلی کے اس مہتم بالشان کارنامے میں مولانا عبدالسلام ندوی کا بھی حصہ ہے۔

سیرت نبویؐ کے بعد علامہ شبلی کا دوسرا اہم علمی منصوبہ سیر الصحابہ کی تالیف وتدوین تھا۔ مولانا عبدالسلام ندویؒ نے لکھا ہے کہ:

> ''اس زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ صحابہ کرام کی مقدس زندگی کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے جس سے لوگوں میں شوق عمل

پیدا ہوا اور اس مثال کو پیش نظر رکھ کر لوگ خود بہ خود اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کی طرف مائل ہوں، یہی وجہ ہے کہ اس عہد تجدید و اصلاح میں ہندوستان کے مجدد اعظم مولانا شبلی مرحوم کو جب مسلمانوں کی ترقی و اصلاح کا خیال پیدا ہوا تو انھوں نے اسی تریاق اکبر کو اس درد کا علاج قرار دیا اور ہمیشہ اس فکر میں رہے کہ صحابہ کرام کے فضائل و مناقب اس ترتیب و جامعیت کے ساتھ لکھے جائیں کہ دنیا کے سامنے معاشرت و اخلاق اور عبادات و معاملات کا بہترین عملی مجموعہ سامنے آجائے۔(۵)

علامہ شبلی کے متعدد مکاتیب میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے، چنانچہ مولانا عبدالسلام ندویؒ نے علامہ شبلیؒ کے فکر و خیال کے مطابق اسوۂ صحابہؓ و صحابیات جیسی معرکہ آراء کتابیں قلم بند کیں، جس میں صحابہ و صحابیات کے عقائد، عبادات، معاملات، حسن اخلاق اور حسن معاشرت کی ایک ایک ادا دکھلائی اور یہ بھی دکھلایا کہ ان کی تابناک زندگیاں عمل بالکتاب والسنۃ کا کامل ترین نمونہ تھیں۔ اصلاً یہ کتابیں دل و دماغ اور ذوق و وجدان کو متاثر کرنے والی ہیں۔ بلاشبہ اپنے موضوع پر اس قدر جامع کتاب اردو میں اب تک نہیں لکھی گئی، خود مولانا عبدالسلام ندوی کو بھی احساس تھا کہ یہ ایک منفرد کاوش ہے۔ وہ اسوۂ صحابہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''کتاب کی ترتیب میں جو کدو کاوش کی گئی ہے، صحت کا جو التزام کیا گیا ہے۔ فضائل اخلاق کے جو عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ صحابہ کرام کے ایک ایک خدوخال کو جس طرح نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے لحاظ سے یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا کہ اس موضوع پر آج تک ایسی جامع کتاب اردو فارسی کیا عربی میں بھی نہیں لکھی گئی۔(۶)

علامہ شبلیؒ کے سلسلہ ناموران اسلام کی تکمیل میں بھی مولانا عبدالسلام ندویؒ کا حصہ ہے۔ اس سلسلہ کے تحت انھوں نے امام رازی اور سیرت عمر بن عبدالعزیز جیسی اہم کتابیں سپرد قلم کیں۔ ان کے دیباچوں میں انھوں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ 'امام رازی' کے متعلق یہ وضاحت کی ہے کہ عقلی علوم کی اصل ترقی پانچویں صدی ہجری میں ہوئی، اس صدی میں خصوصیت کے ساتھ

امام غزالی اور امام رازی نے ان علوم میں غیر معمولی شہرت حاصل کی، اس لئے جس طرح مولانا شبلی نے الغزالی میں فلسفہ وکلام کے متعلق امام غزالی کے خیالات ونظریات کی تشریح کی، اسی طرح امام رازی کے خیالات ونظریات کی تشریح کی ضرورت تھی اور یہ کتاب اسی ضرورت کے پیش نظر قلم بند کی گئی ہے۔(۷)

اس سلسلہ کی دوسری اہم کاوش سیرت عمر بن عبدالعزیز ہے۔ البتہ یہاں یہ بات ذکر کے قابل ہے کہ نامور فرماں روایان اسلام میں علامہ شبلی نے بنوامیہ میں ولید بن عبدالملک کا انتخاب کیا تھا جب کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کا انتخاب کیا اور اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ نامور فرماں روایان اسلام میں علامہ شبلی نے جن لوگوں کا انتخاب کیا تھا ان کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے دنیا کی ترقی کا ایک قدم اور آگے بڑھایا لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز ایک ایسے حکمراں تھے جنھوں نے زمانے کا قدم اس قدر پیچھے کیا کہ وہ صحابہ کرامؓ کی صف سے جاملا۔(۸) ان کی یہ توجیہ بھی علامہ شبلی کے اس خیال کی ترجمانی ہے کہ ''مسلمانوں کی ترقی اس میں نہیں کہ وہ آگے بڑھتے جائیں بلکہ ان کی اصل ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں اور اس قدر پیچھے ہٹتے جائیں کہ صحابۂ کرامؓ کی صف سے جاملیں۔(۹)

ان کے علاوہ ابن خلدون، ابن یمین، اقبال کامل، فقرائے اسلام اور حکمائے اسلام جیسی بلند پایہ تحقیقی کاوشیں بھی دراصل ناموران اسلام ہی کا حصہ ہیں۔ ان کتابوں میں انھوں نے جو کدوکاوش کی ہے، اس میں ان کے دوسرے جذبات کے ساتھ بنیادی جذبہ یہی کارفرما نظر آتا ہے کہ وہ اپنے استاذ کے علمی عزائم کی تکمیل میں حصہ لیں۔

علامہ شبلی شعرالعجم سے پہلے شعرالعرب لکھنا چاہتے تھے۔ ایک مضمون میں انھوں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔(۱۰) مولانا عبدالسلام ندوی نے علامہ شبلی کے اس خواب کو بھی پورا کرنے کا عزم کیا مگر افسوس کہ وہ مکمل نہ ہوسکی۔ اس کا نامکمل مسودہ کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہے۔ البتہ تقریباً اسی اسلوب وانداز میں انھوں نے شعرالہند لکھ کر بہرحال استاذ مرحوم کے سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ شعرالہند بلاشبہہ اردو ادب کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ ہے۔

۱۹۰۳ء میں جب علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے، اس وقت انھوں نے جو

طباعتی منصوبے بنائے تھے، اس میں تاریخ التاریخ اور تاریخ التنقید کی تدوین بھی شامل تھی۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے تاریخ التنقید لکھ کر دراصل اپنے استاذ مرحوم کے ایک دیرینہ خواب کو پورا کرنے کی کوشش کی تھی۔ افسوس کہ یہ کتاب بھی منظر عام پر نہ آسکی اور ہمارا ادبی ذخیرہ اب تک اس طرح کی کاوش سے خالی نظر آتا ہے۔

مستشرقین کے الزامات بلکہ اتہامات کی تردید واصلاح علامہ شبلی کی کتاب زندگی کا ایک نہایت اہم اور روشن باب ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے علامہ مرحوم کے اس مشن کو بھی ہمیشہ جاری رکھا۔ اسلام اور عیسائیت کے تعلق سے انھوں نے متعدد گراں قدر مضامین سپرد قلم کئے، جس میں انھوں نے نہایت مدلل انداز میں عیسائیت، یہودیت اور خاص طور سے مستشرقین کے لغو الزامات کی تردید کی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دوسرے تلامذہ شبلی کے بالمقابل انھوں نے اس موضوع سے زیادہ شغف رکھا، اگر ان کے یہ مضامین یکجا شائع کردیئے جائیں تو اسلام اور عیسائیت کے حوالے سے ہمارے ذخیرے میں ایک اہم کتاب کا اضافہ ہوگا۔

علامہ شبلی کا خیال تھا کہ ہمارے قدیم مورخین نے محض جنگ وجدل اور قتل وخوں ریزی کی داستانیں قلم بند کیں، اس لئے یورپ کے اہل قلم ہماری تاریخوں کو قصائی کی دکان قرار دیتے ہیں۔(۱۱) اسی الزام سے بچنے کے لئے انھوں نے اپنے فلسفہ تاریخ میں تہذیبی وتمدنی تاریخ لکھنے پر زیادہ زور دیا۔ ان کے دوسرے تلامذہ کی طرح مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی تحریروں میں خاص طور سے اس نکتے کو ملحوظ رکھا، اسوۂ صحابہ وصحابیات، تاریخ اخلاق اسلامی اور اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے اور دسیوں مضامین ان کے قلم سے نکلے جن سے ہماری تہذیبی وتمدنی تاریخ کے نہ صرف پوشیدہ اوراق منظر عام پر آئے بلکہ تہذیب وتمدن کے خزینہ میں گراں قدر اضافہ بھی ہوا۔ سیاسی تاریخ کے بالمقابل تہذیبی وتمدنی تاریخ کی تدوین انتہائی دشوار اور دقت طلب کام ہے۔ اسے وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو موضوع پر پوری طرح حاوی ہو۔ اس نکتے کو بیان کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ:

> ’’اقوام وملل کی تاریخ جن اجزا وعناصر کی ترکیب سے وجود میں آتی ہے، ان میں اخلاق کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اسلام نے بھی اس کو خاص

اہمیت دی ہے لیکن اخلاقی عناصر کا سراغ لگانا اور ان میں ایک خاص نظم و ترتیب پیدا کرنا اور ہر دور میں ان کے تغیرات و انقلابات کو دکھلانا سخت مشکل کام ہے، اسی لئے قوموں کی اخلاقی تاریخ مرتب کرنے کی بہت کم جرأت کی گئی کیوں کہ کسی قوم کی سیاسی تاریخ مرتب کر دینا نہایت آسان ہے۔ بادشاہوں کے حالات ان کے دور حکومت کی ترتیب اور ان کے سیاسی کارنامے عام طور پر تاریخوں میں مدون ہیں اور ان کو جمع کر کے سیاسی تاریخ لکھ دینا چنداں دشوار نہیں۔''(۱۳)

مولانا عبدالسلام ندوی نے یہ دشوار اور دقت طلب کام اسوۂ صحابہؓ، تاریخ اخلاق اسلامی اور اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے میں اس طرح انجام دیا ہے کہ اردو میں اس کی کوئی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔

سیرۃ النبیؐ، سیر الصحابہ اور ناموران اسلام کے علاوہ شبلی کی یہ بھی خواہش تھی کہ علوم اسلامیہ پر مفصل کتابیں لکھی جائیں اور دکھلایا جائے کہ اسلام نے تمدن کا قدم کس قدر آگے بڑھایا، یہی وجہ ہے کہ ان کے تلامذہ نے مختلف علوم وفنون پر مستقل کتابیں لکھیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ محمد الخضری کی کتاب تاریخ التشریع الاسلامی شائع ہوئی تو اس کو معیاری پا کر مولانا عبدالسلام ندوی نے اس کا انتہائی رواں اور شگفتہ ترجمہ کیا۔ اس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

''اردو زبان میں جدید طرز پر علوم اسلامیہ کی تاریخ کا خاکہ سب سے پہلے علامہ شبلی مرحوم نے قائم کیا اور علم کلام کی تاریخ میں علم الکلام کے نام سے ایک کتاب لکھی اور چار پانچ جلدوں میں فارسی شاعری کی مبسوط تاریخ مدون کی، اس کے بعد اگر چہ سیرت نبویؐ کی تالیف نے ان کو اس سلسلے کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں دیا تاہم وہ علوم اسلامیہ کی تاریخ کی تکمیل کا بار بار ذکر کرتے رہتے تھے اور اس کو اردو زبان کے لئے ایک جدید تاریخی موضوع خیال فرماتے تھے۔ اگر وہ اپنی زندگی ہی میں سیرت نبویؐ

کی تکمیل سے فارغ ہوسکتے تو بہت ممکن تھا کہ اس دلچسپ موضوع کی طرف دوبارہ متوجہ ہوتے لیکن افسوس کہ موت نے ان کو سیرت نبوی ہی کے مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا، پھر اور سلسلوں کی تکمیل تو ایک عام خیال کی چیز تھی تاہم جب ان کی یادگار میں دارالمصنّفین قائم کیا گیا تو اس کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ یہ انتساب تیمناً وتبرکاً نہ ہو بلکہ اس کو حقیقی طور پر ان کے نام کو زندہ رکھنے کا ذریعہ بنایا جائے، اس لئے ابتدا ہی سے یہ لحاظ رکھا گیا کہ سیرت نبوی کے علاوہ ان کے دماغ نے اور جن تاریخی سلسلوں کا خاکہ قائم کیا تھا ان کی تکمیل کی جائے۔ چنانچہ آج تک دارالمصنّفین سے جو تاریخی اور مذہبی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں تقریباً اکثر ان ہی سلسلوں سے تعلق رکھتی ہیں اور تاریخ فقہ اسلامی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔(۱۲)

ہماری تاریخ میں ماہر تعلیم کی حیثیت سے علامہ شبلی کو بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ انھوں نے تعلیم، قدیم وجدید تعلیم، نصاب تعلیم اور مقاصد تعلیم پر کھل کر بحث کی اور اس کے ذریعہ قوم کا تعلیمی رخ متعین کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر عبیداللہ فراہی[سابق صدر شعبہ عربی لکھنو یونیورسٹی لکھنو] نے اپنی کتاب ''علامہ شبلی کا نظریہ تعلیم'' میں اس پر کسی قدر روشنی ڈالی ہے۔

علامہ شبلی کے بعد اس موضوع سے ان کے تلامذہ میں مولانا عبدالسلام ندوی نے سب سے زیادہ سروکار رکھا۔ متعدد مضامین کے علاوہ التربیۃ الاستقلالیہ کو اردو کا جامہ پہنایا اور اس پر ایک طویل مقدمہ لکھ کر تعلیم کے نقائص اور قدیم وجدید فلسفہ تعلیم، ہندوستان کے نصاب تعلیم، درس نظامیہ کی کمیاں اور ندوہ کی تحریک اصلاح نصاب پر بحث کر کے ایک واضح نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ آج جب ہم تعلیم اور مقاصد تعلیم پر غور وخوض کر رہے ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی اس کاوش سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔

خواتین کی اصلاح وترقی بھی علامہ شبلی کا ایک خواب تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے ان کے اس خواب کو بھی حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ اسوۂ صحابیات اور فطرت نسوانی

دراصل اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔

علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ کے بعد معارف نکالنے کی تمنا کی تو مولانا عبدالسلام ندوی کو بھی اس میں شامل کیا اور جب معارف کا اجراءعمل میں آیا تو مولانا عبدالسلام ندوی دارالمصنّفین میں موجود تھے۔ چنانچہ وہ ماہنامہ معارف کے لئے مدۃ العمر مقالات لکھتے رہے۔ گومعارف پورے طور پران کے ہاتھ میں کبھی نہیں رہا تاہم وہ نئے نئے موضوعات اور جدید تحقیقات پر مسلسل مضامین سے اس کے معیار ووقار کو آب وتاب عطا کرتے رہے اور اپنے استاذ کی خواہش کی تکمیل میں اپنی تمام تر صلاحیتیں لگادیں۔

تصنیف وتالیف کے میدان میں اسلوب نگارش کی جواہمیت ہے اہل نظر اس سے بہ خوبی واقف ہیں کہ اس کے بغیر علمی وادبی کاوشوں میں جاذبیت اور کشش پیدا نہیں ہوتی۔ علامہ شبلی کے کمالات میں ان کا دلآویز طرز تحریر بھی شامل ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اس میں بھی علامہ شبلی کا تتبع کیا اوران کے ادب وانشاء اور اسلوب نگارش کے کامیاب مقلد قرار پائے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے استاذ کے رنگ میں رنگ ملادیا۔ بلاشبہ یہ ان کی علامہ شبلی سے حد درجہ بڑھی ہوئی عقیدت ہی کا مظہر ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے بے شمار مضامین ومقالات سپرد قلم کئے ہیں۔ موضوعاتی اعتبار سے اس میں بڑا تنوع ہے لیکن ان تمام تحریروں میں بنیادی فکر علامہ شبلی کے افکار ونظریات کی توسیع وتکمیل کا جذبہ ہی ہے، حتی کہ انھوں نے معارف کے جو چند شذرات لکھے ان میں بھی یہی بنیادی فکر کارفرما ہے۔ ایک شذرات میں انھوں نے فلسفہ تاریخ پر روشنی ڈالی ہے جو دراصل شبلی کے فلسفہ تاریخ کی خوب صورت ترجمانی ہے۔ (۱۴)

۱۹۰۶ء میں انھوں نے پہلا مضمون لکھا اور اکتوبر ۱۹۵۶ء میں انھوں نے وفات پائی پچاس برس کی اس طویل مدت میں انھیں مسلسل علم وادب کے میدان میں کشورکشا کی حیثیت حاصل رہی اور صحیح معنوں میں انھوں نے علامہ شبلی کی جانشینی کا حق ادا کردیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تلامذہ شبلی میں مولانا عبدالسلام ندوی واحد ایسے شخص ہیں جنھوں نے فکر شبلی اور مرقد شبلی کو کسی حال میں چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔

حواشی

(۱) تعارف عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات

(۲) پروفیسر کبیر احمد جائسی۔ مکاتیب واشعار، مولانا عبدالسلام ندوی ص ۲۳-۲۸۔

(۳) مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۱۴۶۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۴) ادیب شبلی نمبر ص ۲۳۔ مرتبہ ابن فرید۔ علی گڑھ ۱۹۶۰ء

(۵) مولانا عبدالسلام ندوی۔ اسوۂ صحابہ ج ۱، ص ۵-۶، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۶) مولانا عبدالسلام ندوی۔ دیباچہ اسوۂ صحابہ ج ۱، ص ۸، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۷) مولانا عبدالسلام ندوی۔ دیباچہ امام رازی، ص ۱-۲، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۸) مولانا عبدالسلام ندوی، دیباچہ سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ ص ۱-۲، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۹) مولانا سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی، ص ۲۹۰، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۱۰) مقالات شبلی، ج ۲، ص ۲۹۔ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۱۱) مقالات شبلی ج ۴، ص ۵۹۔ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۱۲) مولانا عبدالسلام ندوی۔ تاریخ اخلاق اسلامی، ص ۱، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۱۳) مولانا عبدالسلام ندوی۔ دیباچہ تاریخ فقہ اسلامی، ص ۱-۲، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۱۴) ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ۔ مارچ ۱۹۱۷ء، ص ۴-۶۔

مورخانہ بصیرت

مولانا عبدالسلام ندوی کی ذات مجموعہ اوصاف وکمالات تھی۔ وہ صحیح معنوں میں عالم و مصنف اور ممتاز اہل قلم تھے۔ وہ جس موضوع پر جب چاہتے بے تکلف لکھتے اور اس کا حق ادا کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ، کلام، تعلیم، شعروادب، تذکرہ، تاریخ، سوانح، وغیرہ مختلف موضوعات پر ان کی تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ یہاں ان کے تاریخی شعور اور بعض تاریخی کاوشوں کا ذکر ان کی تاریخی بصیرت کے پس منظر میں کیا جاتا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی علامہ شبلی جیسے عظیم مؤرخ کے فیض یافتہ تھے، اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ تاریخ کا ذوق انہیں ورثے میں ملا تھا تو بیجا نہ ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے استاذ کے اس نقطۂ نظر کے قائل نظر آتے ہیں کہ تاریخ صرف جنگ و جدل، خوں ریزی، قتل و غارت گری اور معرکہ آرائیوں کا نام نہیں بلکہ اس میں تہذیب وتمدن، شائستگی اور طرز معاشرت کا ذکر ضروری ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی تو اس امر میں ایک قدم اور آگے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے تاریخ کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس میں صرف تہذیبی وتمدنی اقدار و روایات کا ذکر ہے، سیاسی واقعات کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں، اسے ان کی خوبی بھی کہہ سکتے ہیں اور خامی بھی، خوبی اس معنی میں کہ تہذیب وتمدن کی تاریخ کو یورپ کے اہل قلم بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ہمارے دورِ جدید کے مؤرخین نے بھی اس کی افادیت کا ذکر کیا ہے اور خامی اس معنی میں کہ یہ بہرحال تصویر کا ایک رخ ہے، دونوں نہیں۔ اور یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مؤرخ کا جو عام مفہوم ہے اگر اس کی روشنی میں مولانا عبدالسلام کی تحریروں کو موضوع بحث بنایا جائے تو انہیں مؤرخ کہنے میں تامل ہوگا اس لئے ضروری ہے کہ جدید فلسفہ تاریخ کی روشنی میں اور وسعت و بلند ظرفی کے ساتھ مولانا کی مؤرخانہ کاوشوں کا اعتراف کیا جائے۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے کوئی مستقل تاریخ نہیں لکھی اور نہ کسی عہد کے مخصوص حالات وواقعات کا جائزہ لیا، البتہ ان کی بعض تصانیف اور بعض مسلسل مضامین کسی حد تک تاریخ کا جزء ضرور معلوم ہوتے ہیں، اس مضمون میں ہم انہیں کا ذکر کرتے ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی علمی زندگی کا آغاز ماہنامہ الندوہ سے کیا اور اس میں متعدد مضامین لکھے۔ ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بھانپ کر علامہ شبلی نے ان کے ایک بڑے مصنف اور اہل قلم ہونے کی پیشن گوئی کی تھی اور اسی تاثر کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کو الندوہ کا سب ایڈیٹر مقرر کیا۔ انہوں نے الندوہ میں جو مضامین لکھے وہ مختلف موضوعات پر ہیں تاہم بعض مضامین کا تعلق تاریخ سے بھی ہے، مثلاً قسطنطنیہ کے کتب خانے [مارچ ۱۹۱۰ء] العرب قبل الاسلام [نومبر ۱۹۱۰ء] مسلمانوں کی جغرافیانہ خدمات [مئی ۱۹۱۰] وغیرہ۔

الندوہ کے بعد وہ الہلال کلکتہ سے وابستہ ہوگئے چونکہ الہلال میں نام کے ساتھ مضامین شائع نہیں ہوتے تھے اس لیے معلوم نہیں کہ مولانا نے تاریخ پر کوئی مضمون لکھا تھا یا نہیں۔

علامہ شبلی نعمانی کی وفات کے بعد ۱۹۱۴ء میں وہ دارالمصنفین کے بقا وترقی کے لئے اعظم گڈھ آئے۔ پھر زندگی بھر اس سے پیمان وفا باندھے رکھا، یہاں انہوں نے مختلف موضوعات پر کتب ومضامین سپرد قلم کئے جس میں متعدد کا تعلق تاریخ سے ہے۔

دارالمصنفین میں سید صاحب نے سلسلہ سیرۃ النبی کی تدوین وتالیف کو سنبھالا تو مولانا عبدالسلام ندوی نے سلسلہ سیر الصحابہؓ کا آغاز کیا اور اسوۂ صحابہ جیسی معرکۃ الآراء کتاب قلم بند کی جس میں صحابہؓ وصحابیاتؓ کے عقاید، عبادات، معاملات، طرز معاشرت، اخلاق وکردار نیز علمی و دینی اور سیاسی وعملی کارناموں کو اس انداز سے قلم بند کیا گیا ہے کہ اس سے اسلام کی تعلیمات کا عملی نقشہ آنکھوں میں بھر جاتا ہے۔

اس کتاب کو اگرچہ مذہبی تقدس حاصل ہے اور یہ اسلام کی تعلیمات کا ایک عملی مرقع پیش کرتی ہے تاہم درحقیقت یہ صحابہ کرامؓ کی تہذیب وثقافت اور طرز معاشرت کی تاریخ کا ایک نمایاں حصہ قرار دیئے جانے کے لائق ہے اور یہ اپنے سلسلہ کی سب سے اہم کتاب ہے۔ خود مصنف کو بھی اس بات احساس تھا، چنانچہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''کتاب کی ترتیب میں جو کدو کاوش کی گئی ہے، صحت کا جو التزام کیا گیا ہے، فضائل و اخلاق کے جو عنوانات قائم کئے گئے ہیں، صحابہ کرامؓ کی زندگی کے ایک ایک خط و خال کو جس طرح نمایاں کیا گیا ہے، اس لحاظ یہ دعویٰ بے جانہ ہوگا کہ اس موضوع پر آج تک ایسی جامع کتاب اردو فارسی کیا عربی میں بھی نہیں لکھی گئی۔'' (۱)

مولانا عبدالسلام ندوی کے اس دعوے میں اگر اس قدر اضافہ کر دیا جائے کہ عہد صحابہ کے متعلق اس قدر جامع اور مفصل کتاب دنیا کی کسی زبان میں نہیں لکھی گئی تو بیجا نہ ہوگا۔

مشہور برطانوی مؤرخ ایڈوڈ ہارٹ پول لیکی کی کتاب تاریخ اخلاق یورپ جب شائع ہوئی اور مولانا کے زیر مطالعہ آئی تو مولانا اس سے بہت متاثر ہوئے اور اس پر ایک طویل تبصرہ لکھا۔ (۲) جس سے کتاب کی اہمیت وافادیت کے ساتھ فن تاریخ سے مولانا کی دلچسپی اور اس سے گہری واقفیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکی کی اسی کتاب کو دیکھ کر مولانا کو خیال پیدا ہوا کہ اسلامی اخلاق کی تاریخ لکھی جائے، چنانچہ انہوں نے دو حصوں میں یہ کتاب لکھی مگر اس کا پہلا حصہ ہی شائع ہو سکا ہے، دوسرا حصہ غالباً مکمل نہیں ہو سکا تھا اس لئے شائع نہیں ہوا۔

پہلے حصہ میں مولانا نے نبوت سے پہلے کے عربوں کے اخلاق و کردار کی مرقع آرائی کی ہے۔ بعد ازاں اس میں اسلام نے جو انقلاب پیدا کیا اور عہد رسالت میں جس طرح اخلاق و کردار کی تعمیر و تشکیل عمل میں آئی، اس کی داستان قلم بند کی ہے۔ اس موضوع پر بھی اردو میں شاید ہی کوئی کتاب لکھی گئی ہو۔ یقیناً یہ مولانا عبدالسلام ندوی کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

دارالمصنّفین سے ان کی جو پہلی کاوش منظر عام پر آئی وہ ڈاکٹر گستاولی بان کی کتاب کا اردو ترجمہ انقلاب الامم ہے جس میں ان نفسی اصول و قوائد اور اخلاقی قوانین کی توضیح و تشریح کی گئی ہے جن سے قوموں کی ترقی اور تنزلی وابستہ ہوتی ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اس کتاب پر جو طویل مبسوط اور محققانہ مقدمہ سپرد قلم کیا ہے۔ اس سے ان کے مذاق تاریخ اور مورخانہ شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک تاریخ کی بڑی اہمیت ہے اور وہ کسی قوم کی تاریخ کو کسی مورخ کا احسان نہیں مانتے بلکہ اسے ہر قوم کا سرمایہ تسلیم کرتے ہیں جو خود بخود تیار ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''علم ومذہب ،تہذیب وتمدن ،ملک وسلطنت ہر مہذب قوم کا سرمایہ حیات ہیں اورانہی چیزوں کی ترکیب وامتزاج سے ہرقوم کا تاریخی مواد تیار ہوتا ہے،اس بنا پر ہر متمدن قوم اپنا تاریخی سرمایہ اپنے ساتھ لاتی ہے اوراپنے وجود کے ساتھ ساتھ اس کو محفوظ رکھتی ہے۔وہ ان مواد کی تیاری اور پختگی میں کسی مورخ کی ممنون احسان نہیں ہوتی بلکہ خود مورخ اس قوم کا گراں بارمنت ہوتا ہے۔''(۳)

مولانا عبدالسلام ندوی کا خیال ہے کہ قوم کی تاریخ میں کسی مورخ کا کوئی احسان نہیں لیکن تاریخ کے مواد کو سلیقے سے ترتیب دینا اوراس کو از اول تا آخر ربط وتسلسل کے ساتھ قلم بند کرنا مورخ کا اصل فریضہ ہے اور مورخ کے انہیں فرائض کے پیش نظر وہ تاریخ کی تعریف مجموعہ ارتقائے اقوام بتاتے ہیں۔ان کی تفصیل انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

> ''مواد کی موزوں ترتیب اس کا مکمل نظام اور اس کے ابتدائی وانتہائی سلسلوں میں توفیق وتطبیق غرض اس کے تمام ارتقائی مدارج کی تفصیل و توضیح ایک مورخ کا کام ہے اوراس حقیقت سے تاریخ کی نہایت سادہ، مختصر، عام فہم اور جامع تعریف ''مجموعہ ارتقائے قوم'' کی ترکیب اضافی کے ساتھ کی جاسکتی ہے''۔(۴)

جدید فلسفہ تاریخ کے لئے مولانا عبدالسلام ندوی یورپ کے مفکرین اور فلاسفہ کے بڑے مداح تھے۔موسیو پولیاں،موسیوایبواورموسیو لیبان وغیرہ نے علم الاخلاق اورنفسیات کو بڑی اہمیت دی اورقوموں کی تاریخ کے مطالعے میں ان علوم کا جائزہ ضروری قرار دیا۔ان مفکرین اور خاص طور سے لیبان کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> ''اگر موسیو پولیاں اور موسیوایبو کونظر انداز کردیا جائے تو اس گروہ میں صرف لیبان پہلا شخص ہے جس نے اس کمی کو پورا کیا ہے۔اس نے تمام دنیا کی قوموں کے نظام اخلاق کا مطالعہ کیا،ان کے تاریخ وتمدن پر روشنی ڈالی،ان دونوں میں سلسلہ علل واسباب قائم کیا اورتمام تاریخی مظاہر یعنی

حکومت، سیاست، تمدن، مذہب اور لٹریچر وغیرہ کو اسی نظام اخلاق کا پرتو
قرار دیا اور اس طرح ایک جدید فلسفہ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔‘‘ (۵)

لیبان کے اس قدر معترف ہونے کے باوجود وہ یورپ کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے کہ تاریخ کے فن نے جس قدر ترقی کی ہے وہ تمام کی تمام یورپ کی دین ہے، بلکہ ان کا خیال ہے کہ:

’’درحقیقت صرف لیبان ہی اس فلسفہ تاریخ کا موجد نہیں قرار دیا جا سکتا
بلکہ اسلام اور علمائے اسلام نے مدتوں پہلے اس حقیقت کے چہرے کو بے
نقاب کر دیا تھا‘‘۔ (۶)

لیبان نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کی بنیاد دو باتوں پر ہے، ایک یہ کہ ہر قوم میں چند اخلاقی اوصاف ہوتے ہیں جو اس کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ ان اوصاف میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ ان دونوں باتوں کے سلسلہ میں مولانا کا خیال ہے کہ ان کا سراغ قرآن مجید میں بھی ملتا ہے۔ (۷) انقلاب الامم کے مقدمہ میں مولانا نے اس کی تفصیلات قلم بند کر دی ہیں اور اس سے شواہد بھی نقل کر دیئے ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ

’’لیبان کو جس فلسفہ تاریخ کی ایجاد کا شرف حاصل ہے وہ اگرچہ ابن
خلدون کے فلسفہ تاریخ سے مختلف ہے تاہم چونکہ دونوں کا موضوع ایک
ہے، اس لیے جابجا دونوں کے مضامین میں اشتراک پایا جاتا ہے اور اس
بنا پر دبی زبان سے کہہ سکتے ہیں کہ لیبان کے نظریات سے اسلامی لٹریچر
بالکل ناآشنا نہیں ہے‘‘۔ (۸)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض دوسرے اہل قلم کی طرح مولانا عبدالسلام ندوی بھی یورپ کے فلسفہ تاریخ کے موید و مداح تھے، ورنہ وہ دبی زبان کا لفظ استعمال نہ کرتے۔ انہوں نے ایڈورڈ پول لیکی کی کتاب تاریخ اخلاق پر جو تبصرہ کیا ہے، اس سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

قدیم زمانہ میں تاریخ کا دائرہ صرف سلطنتوں کے انقلابات اور اکابران
قوم کے حالات زندگی تک محدود تھا لیکن یورپ نے تمدن و معاشرت اور

علوم وفنون غرض کہ انسان کے دل ودماغ کے تمام نتائج کو شامل کر کے اس
فن کو گوناگوں مباحث سے لبریز کر دیا۔''(۹)

فن تاریخ نے کس طرح ترقی کی اور روایت کے فن کو کس طرح اعتبار ملا، مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنے ایک مضمون میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''زمین، سمندر، پہاڑ اگرچہ دنیا کے ساتھ پیدا ہوئے لیکن انسان ان سے ایک مدت کے بعد متمتع ہوا۔ زمانہ قدیم کا ایک وحشی آدمی، پہاڑوں کے تیرہ وتاریک غار اور اس کی آس پاس کی زمین کے سواء دنیا کے دوسرے حصوں سے ناواقف تھا لیکن بعد کی ترقی یافتہ نسلوں نے دنیا کے گوشے گوشے کا پتہ لگایا اور ان کی تقسیم وتوزیع کی، ان میں نظام ترتیب پیدا کیا اور سطح سے گذر کر تہہ کے تمام رموز وحقائق دریافت کئے۔ آج زمین سے سونا، سمندر سے موتی، پہاڑ سے لعل اسی چھان بین کی بدولت نکل رہا ہے۔ فن تاریخ نے بھی اسی طریقہ پر اپنی ترقی کے تمام مراحل طے کئے۔ انسان جب تک بالکل وحشیانہ حالت میں بسر کرتا تھا وہ اپنے تاریخی سرمائے کو زبانی روایتوں کی صورت میں محفوظ رکھتا تھا لیکن جب آئندہ کی نسلوں نے تہذیب وتمدن میں ترقی کی اور فن تحریر وکتابت کا رواج ہوا تو یہ تمام روایتیں قلم بند کر لی گئیں اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں اس قدر ترقی ہوئی کہ فن روایت ایک مستقل فن بن گیا۔''(۱۰)

ذخیرہ روایت کی حیثیت اور تاریخی واقعات میں ربط وتسلسل کو مولانا عبدالسلام ندوی ضروری قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ انہیں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ''موجودہ زمانہ گزشتہ زمانہ سے خود بخود کیوں کر پیدا ہو گیا ہے'' ان کے الفاظ میں:

علوم وفنون کی تاریخ اگرچہ اس ترقی پر ناز کر سکتی ہے لیکن درحقیقت روایتوں کا یہ ذخیرہ صرف دریا تھا موتی نہ تھا۔ معلومات کا یہ تودہ صرف پہاڑ تھا لعل نہ تھا، تاریخ کا یہ صفحہ کان تھا سونا نہ تھا، اس لیے مغز سخن تک

پہونچنے کے لئے اس سے زیادہ چھان بین اس سے زیادہ ادھیڑ بن اس سے زیادہ کدوکاش کی ضرورت تھی، اس سلسلہ میں سب سے مقدم کام یہ تھا کہ تاریخی واقعات میں ایک ایسا نظام، ایک ایسا ربط، ایک ایسا تسلسل پیدا کیا جائے، جس سے صاف طور پر معلوم ہو جائے کہ ''موجودہ زمانہ گزشتہ زمانہ سے خود بخود کیونکر پیدا ہوا''۔(۱۱)

تاریخ نویسی میں واقعات کے اسباب وعلل کی تلاش پر یورپ کے مورخین بہت زور دیتے ہیں اور ان کے نزدیک علل واسباب کی بڑی اہمیت وافادیت ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی بھی اپنے استاذ علامہ شبلی کی طرح اس اصول کے بڑے ہم نوا ہیں بلکہ ان سے ایک قدم آگے بڑھ کر اسباب وعلل کے لئے نوعیت واقعہ کی شرط بھی لگاتے ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''واقعات کی نوعیت کے لحاظ سے ہر قسم کے واقعات کے لئے ایک ایسا عام سلسلہ علل واسباب قائم کیا جائے کہ تمام واقعہ اس سلسلہ کی کڑیاں بن جائیں اور مسلمانوں کو فخر ہے کہ سب سے پہلے علامہ ابن خلدون نے اس فلسفہ کی بنیاد ڈالی، لیکن درحقیقت یہ کام جس قدر اہم مفید اور نتیجہ خیز ہے، اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ ایک طرف تو واقعات اس کثرت سے ہیں کہ آسانی کے ساتھ ان کا استقصا نہیں کیا جا سکتا، دوسری طرف تنوع، تناقض، تبائن اور اختلاف نے ان کی کڑیوں کو باہم اس قدر الجھا دیا ہے کہ ان میں کوئی قدر مشترک نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اس بنا پر ان کو کسی اصول کلیہ کے تحت میں نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن خلدون نے اگرچہ تاریخی واقعات کی تنقید کے تمام اصول قائم کر دیئے لیکن خود اپنی تاریخ میں اس سے کام نہ لے سکا، لیکن واقعات میں نظم وترتیب پیدا کرنے کا ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جزئی واقعات کو بالکل نظرانداز کر کے خود تاریخ کی علت مشترکہ پیدا کی جائے اور دنیا کے تمام تاریخی واقعات کی بکھری ہوئی کڑیاں اسی سلسلہ میں مربوط کر دی جائیں۔

یہ طریقہ اگر چہ نسبتاً پہلے طریقہ سے آسان ہے کیونکہ اس میں ایک طرف تو تمام جزئی واقعات کا استقصاء کرنا پڑتا تھا تو دوسری طرف ہر ایک واقعہ یا کم از کم ایک نوعیت کے واقعات کے لیے الگ الگ سلسلہ علل واسباب کے دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی تھی، اس لئے روایت و درایت ودنوں سے ساتھ ساتھ کام لینا پڑتا تھا لیکن اس دوسری روش کے اختیار کرنے سے یہ دونوں مشکلیں خود بخود حل ہو جاتی ہیں، ایک عام اور مشترک سلسلہ علل واسباب قائم کرنے سے ہر واقعہ کے لئے مفصل علت کی جستجو کی ضرورت نہیں ہوتی، اسی طرح تمام جزئی واقعات سے بھی بے نیازی ہو جاتی ہے کیونکہ خود تاریخ مجموعی حیثیت سے اس سلسلہ میں داخل ہو جاتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سی ایسی عام اور مشترک چیز ہے جو تمام تاریخی واقعات ونتائج کا محور قرار دی جاسکتی ہے؟ اس نقطہ پر پہونچ کر اس طرح کی تمام آسانیاں مبدل بہ مشکلات ہو جاتی ہیں اور یہ سوال بالکل ایک معمہ بن جاتا ہے، دنیا میں صرف دو چیزیں ہیں جو عام طور پر تمام قوموں پر حکمرانی کرتی ہیں، یعنی مذہب اور حکومت اس لئے اگر دنیا کی تاریخ کا کوئی عام سبب قرار دیا جا سکتا ہے تو نگاہ انتخاب ان دونوں کے سواء کسی دوسری چیز پر نہیں پڑ سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر مورخین نے اس سوال کے جواب میں انہیں دونوں چیزوں کا نام لیا ہے لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ خود مذہب اور حکومت کو کس نے پیدا کیا ہے تو اس سوال کا جواب ہم کو مذہب اور سلطنت کے دائرہ حکومت میں نہیں مل سکتا، اس کے لئے ہم کو ان کے حدود سے آگے بڑھنا ہوگا''۔(۱۲)

ان مباحث سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی کا تاریخی شعور کس درجہ پختہ تھا۔ وہ نہ صرف اسلام کے فلسفہ تاریخ سے پوری طرح واقف تھے بلکہ تراجم کے ذریعہ یورپ کے فلسفہ تاریخ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اس شعور وآگہی سے

بھرپور کام لیا۔ ان کی تاریخی تحریروں میں ان کی مورخانہ بصیرت کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔ اسوۂ صحابہ وصحابیات ہو یا تاریخ الحرمین الشریفین، انقلاب الامم ہو یا ہندوستان کی تمدنی تاریخ، ہر جگہ ان کا تاریخی شعور نمایاں ہے۔

آخری دور میں انہوں نے ہندوستان کی تمدنی تاریخ پر قلم اٹھایا۔ اس سلسلے کے چار مضامین [۱] رفاہ عام کے کام [۲] نئے شہر، قصبے اور گاؤں [۳] ترقی حیوانات [۴] تعلیم کی ترقی، انہوں نے لکھے جو دارالمصنّفین کی کتاب مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے میں بعض دوسرے مضامین کے ساتھ شایع ہوئے۔ ان اچھوتے موضوعات سے بھی تاریخ ہند پر ان کی گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے عہد وسطیٰ کی تہذیبی اور تمدنی تاریخ کے ان گوشوں کو روشن کیا جن کا تعلق رزم سے نہیں بزم سے ہے اور دراصل مولانا عبدالسلام ندوی بزم کے مورخ تھے، ان کی یہی خوبی ان کی مورخانہ بصیرت کی غماز ہے۔

حواشی

(۱) اسوۂ صحابہ حصہ اول مقدمہ ص ۸
(۲) ماہنامہ معارف مارچ ۱۹۱۸ء
(۳) مقدمہ انقلاب الامم ص ۸
(۴) ایضاً
(۵) ایضاً ص ۱۰
(۶) ایضاً
(۷) ایضاً
(۸) ایضاً ص ۱۱
(۹) ماہنامہ معارف مارچ ۱۹۱۷ء ص ۴۹
(۱۰) ماہنامہ معارف مارچ ۱۹۱۷ء ص ۴
(۱۱) ایضاً
(۱۲) ایضاً ص ۴۔۶

ادب وانشاء

مولانا عبدالسلام ندوی کا درجہ بحیثیت ادیب وانشاء پرداز مسلم ہے۔ وہ اپنے عہد کے ممتاز اور نامور ادیب وانشاپرداز تھے۔ اس حیثیت سے انہوں نے اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ادبی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

مولانا عبدالسلام ندوی اردو کے ساتھ عربی اور فارسی ادبیات پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ وہ تاریخ ادب اردو کے نشیب وفراز سے بخوبی واقف تھے۔ عربی وفارسی کے ادب العالیہ پر ان کی نگاہ تھی۔ اگر ابن یمین اور مولانا کاتبی نیشاپوری جیسی کتابوں سے ان کے فارسی ادبیات کے وسیع مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے تو شعرالعرب تاریخ ادب عربی پر ان کی ماہرانہ نظر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ عربی نثر ونظم کی انہوں نے جو تاریخ ماہنامہ معارف میں لکھی ہے۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب عربی کے عہد بہ عہد ارتقاء، تغیرات وانقلابات اور عربی ادباء وشعراء کا انہوں نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ ان کے متعدد مقالات سے بھی اس کی شہادتیں ملتی ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی اردو شعروادب کے اپنے عہد کے بڑے پارکھ اور جوہری تھے۔ شعرالہند کی دونوں جلدیں اور مقالات عبدالسلام جو ان کے ادبی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کے ادیب، نقاد اور انشاپرداز ہونے کے ثبوت وشہادت سے پر ہیں۔ ایک ادیب اور انشاپرداز کو کس درجہ وسیع النظر اور علوم فنون کا واقف کار ہونا چاہئے، مولانا اس سے پوری طرح واقف تھے، انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''ایک انشاء پرداز کو ہر علم اور فن سے تعلق رکھنا چاہئے۔ یہاں تک کہ اس کو
> یہ معلوم ہونا چاہئے کہ عورتوں کے حلقۂ ماتم میں کیا کہہ کر رویا جاتا ہے۔
> مشاطہ جب دلہن سنوارتی ہے تو کون سے فقرے بولتی ہے۔ بازار میں پکار

کر سودا بیچنے والے کیا کہتے ہیں۔ ایک ادیب یا انشاء پرداز ان طریقوں سے جو سرمایۂ معلومات فراہم کرتا ہے وہ اس کا گمشدہ مال ہے جس کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ حکمت کی بات ایک مسلمان کا گمشدہ مال ہے، جب وہ اس کو مل جاتا ہے تو اس کا سب سے زیادہ مستحق ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل حکمت، حکمت کی بات ایسے لوگوں سے بھی سیکھ سکتے ہیں جو خود حکیم نہیں ہوتے۔ بقول سعدی ''ادب از کہ آموختی، گفت از بے ادباں'' اسی طرح ایک انشاء پرداز، انشاء پردازی کے نکتے ان لوگوں سے بھی سیکھ سکتا ہے جو خود انشاء پرداز نہیں ہوتے۔ عربیت کے ایک بہت بڑے امام، قصہ گویوں اور شعبدہ بازوں کے حلقہ میں جا جا کر شریک ہوتے تھے، اس پر لوگوں نے ان کو سخت ملامت کی کہ آپ اتنے بڑے امام ہو کر اس قسم کی ذلیل صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں اس لئے شریک ہوتا ہوں کہ ان لوگوں کی ہذیان سرائی میں بھی بعض ایسے لطیف انشاء پردازانہ فقرے شامل ہوتے ہیں جو ہمارے وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتے۔ صاحب مثل السائر نے اس قسم کے بہت سے انشاء پردازانہ فقرے جمع کئے ہیں، جن سے اس نے اپنی تحریر میں آب و رنگ پیدا کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ ایک عورت جس کی پہلوٹی کا لڑکا مر گیا تھا یہ کہہ کر رو رہی تھی کہ میرے رنج وغم کا کیا ٹھکانہ، یہ پہلی اشرفی تھی جو میری جیب میں پڑی تھی، میں نے اس فقرے کو یاد کر لیا اور جب میرے ایک دوست کا پہلوٹی کا لڑکا مر گیا تو میں نے تعزیت نامہ میں کسی قدر تغیر کے ساتھ اس فقرے کو شامل کر لیا۔ اس نے ایک خاص عنوان یہ قائم کیا ہے۔ انشاء پردازی سیکھنے کے کیا طریقے ہیں؟ اور اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ بہت سے نادر مضامین بازاری اور پیشہ ور لوگوں کے ذہن میں آسکتے ہیں۔ البتہ وہ ان کو مناسب الفاظ میں ادا نہیں کر سکتے۔

بغداد میں چند معمولی آدمی رمضان میں محلوں میں گھوم گھوم کر سحری کھانے
کے لئے موزوں الفاظ میں جو شعر کے مثل ہوتے ہیں لوگوں کو جگاتے
ہیں، میں نے اس قسم کے فقرے سنے تو وہ نہایت نادر معنی پر مشتمل تھے۔
البتہ جن الفاظ میں وہ ادا کئے گئے تھے وہ ان کے لئے موزوں نہ تھے۔
حافظ نے لکھا ہے کہ مضامین تو بازاروں میں پڑے ہوئے ملتے ہیں۔ البتہ
موزوں الفاظ میں ان کا ادا کرنا ایک شاعر یا ادیب کا اصلی کام ہے۔''(۱)

اس طویل اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا کا ادبی شعور کس درجہ پختہ اور بلند تھا۔ وہ ادب، شعر، نثر اور غیر نثر کی تعریف، حدود و قیود اور منشا و مدعا کے بڑے واقف کار تھے۔ اس پر انہوں نے اپنے کتب و مضامین میں بحث کی ہے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ وہ کس درجہ فنکار ادیب تھے، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ادب و انشاء کی لالہ کاری، رعنائی اور نثر کی سادگی و شائستگی پر انہیں کمال دست رس حاصل تھا۔ جس کی بنا پر ان کی تحریروں میں ادب و انشاء کی رعنائی و زیبائی کے بڑے دل فریب جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں اس کی چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں:

ا۔ ''دنیا نے مادیت اور رومانیت کے بہت سے مناظر دیکھے ہیں۔ اس نے آفتاب و ماہتاب کی جلوہ گری کا نظارہ کیا ہے۔ قوس و قزح کی بو قلمونیاں دیکھی ہیں۔ لب جو کے طراوت خیز سبزہ زاروں کی تماشائی ہوئی ہے۔ بادصبا نے اس کے سامنے اٹھکھیلیاں کی ہیں۔ پھولوں نے اس کے سامنے آدم کے آگے سر جھکایا ہے، اعجاز عیسیٰ نے اس کے قالب بے جان میں روح پھونکی ہے۔ عصائے موسیٰ نے اس کے سامنے پھنکاریں ماری ہیں۔ بیت المقدس کا منارہ اسی نے بلند کیا ہے۔ بیت الحرام کی دیواروں پر اسی نے رڈا چڑھایا ہے اور اس کے ایک ایک گوشے سے توحید الٰہی کی غلغلہ انداز صدا اس کی فضا میں گونجی ہے، لیکن یہ سب کچھ کیا تھا؟ ایک عبرت انگیز تماشا تھا۔ جو چشم زدن میں فنا ہو گیا! آفتاب کے نور کو دامن شب نے چھپا لیا۔ قوسِ قزح آفتاب ہی کا پرتو تھی، ساتھ ساتھ سایہ کی

طرح فنا ہوگئی۔ سبزۂ خوابیدہ کو دست خزاں کی تھپکیوں نے موت کی نیند سلا دیا۔ صرصر کے جھوکوں سے مرجھا کر گل خنداں، دامن گلزار کا بدنما داغ بن گئے۔ غنچوں نے آنکھ کھولی، تو گل چیں کے دست بیداد میں نظر آئے۔ آدم، شجر خزاں رسید کی طرح عریاں ہوگئے۔ اعجاز عیسیٰؑ کی زبان چند دنوں کے بعد گنگ ہوگئی۔ عصائے موسیٰ اپنی سیرتِ اولیٰ کی طرف لوٹ آیا۔ بیت المقدس کے کنگرے شرک کا نشیمن بن گئے۔ اور بیت الحرام کی دیواروں پر بتوں کی نمائش کی گئی۔ جن کی بے زبانی نے توحید الٰہی کے راگ کو دفعۃً خاموش کر دیا! لیکن دنیا نے مدینہ کی پتھریلی زمین میں ان سب سے الگ ایک اور آشیانہ قدس کی زیادت کی ہے، جس کے انقلابات اس کو ان تمام مناظر سے بالکل مختلف نظر آئے! وہ زندہ ہوا، تو پھر کبھی نہ مرا۔ وہ تعمیر ہوا تو پھر کبھی نہ اجڑا۔ اور اس میں مرغانِ حرم نے توحید کی نغمہ سرائی کی تو ان کی زبان کبھی خاموش نہ ہوئی! اسی آشیانہ قدس کا مبارک نام ''مسجد نبویؐ'' ہے، جس کی خاکِ پاک کو دنیا ہر سال سرمۂ چشم بناتی ہے، لیکن پھر بھی تسکین نہیں ہوتی! اس لئے ہم دنیا کو دوبارہ اس کی روحانی زیارت کرانا چاہتے ہیں۔''(۲)

نثر میں دریا کی روانی اور جذبات کی موجیں کس طرح متلاطم ہوتی ہیں اس کا ایک منظر یہ ہے۔

''عام طور پر ہمارے اہل ادب نے شعر کی تقسیم، وزن، قافیہ اور ردیف وغیرہ کے لحاظ سے کی ہے۔ اس لئے شاعری کی صرف چند محدود صنفیں مثلاً غزل، قصیدہ اور مثنوی وغیرہ پیدا ہوئی ہیں لیکن محققین ادباء نے جن کے سامنے عربی شاعری کے بہترین نمونے تھے۔ شاعری کی تقسیم مضمون و معنی کے لحاظ سے کی ہے۔ اس لئے ان اصناف کے علاوہ انہوں نے شاعری کی اور بھی چند صنفیں نکالی ہیں، جو گو وزن اور قافیہ میں اصناف

متذکرہ بالا سے مختلف نہیں ہیں لیکن معناً ان میں زمین و آسمان کا فرق
ہے، مثلاً بعض اہل ادب کے نزدیک شاعری کی بنیاد خوف، رغبت ،
مسرت اور غصہ پر رکھی گئی ہے اور ان ہی جذبات کے اختلاف سے
شاعری کی تمام مختلف قسمیں پیدا ہوئیں ہیں مثلاً خوف سے اعتذار و
استعفاف، رغبت سے مدح وشکر، مسرت سے غزل اور غصہ سے ہجو و
عتاب وغیرہ کی مختلف صنفیں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔'' (۳)

مولانا عبدالسلام ندوی نے تاریخ التنقید لکھ کر اردو میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا چاہا۔ ادب وانشاء سے گذر کر نقاد کے مرتبے پر فائز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ادب بلکہ ادبیات پر گہری نظر ہو۔ تاریخ التنقید کے نامکمل اوراق شہادت دیتے ہیں کہ مولانا عبدالسلام ندوی نقد وانتقاد کے بڑے بلند عہدے پر فائز تھے۔ اس کے باوجود ان کی نثری رعنائی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ انہوں نے فلسفہ وکلام اور اخلاق اسلامی میں بھی ادب وانشا کے موتی رولے ہیں۔ گذشتہ اوراق میں متعدد اقتباسات گذر چکے ہیں۔ اس لئے یہاں ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ایک ادیب کو مختلف علوم وفنون سے گہری واقفیت اور مجتہدانہ نگاہ ضروری ہے اور اس پس منظر میں مولانا عبدالسلام ندوی کی شخصیت اور ان کے علوم وافکار کا مطالعہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ عربی زبان وادب پر گہری نگاہ تھی۔
۲۔ ادبیات فارسی کے بڑے پارکھ اور جوہری تھے۔
۳۔ فلسفہ وکلام کی تاریخ اور اس کے فن سے بخوبی واقف تھے۔
۴۔ ایک خاص تعلیمی نقطہ نظر تھا اور جدید وقدیم تعلیم اور اس کے نشیب وفراز پر گہری نگاہ تھی۔
۵۔ نقد اور اصول نقد سے پورے طور پر واقف تھے۔
۶۔ شعر کے بڑے پارکھ اور سخن فہم تھے۔
۷۔ متعدد عربی وفارسی شعراء اور ان کی شاعری سے گہری واقفیت تھی۔
۸۔ تراجم کے ذریعہ مغربی شعر وادب اور فکر وفلسفہ سے کسی قدر واقف تھے۔

۹۔حکمائے اسلام اوران کی کاوشوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔

۱۰۔اخلاق یورپ کا مطالعہ کیا تھا۔

۱۱۔اخلاق اسلامی پرانہوں نے پہلی کتاب لکھی۔

۱۲۔فلسفہ تاریخ سے بھی آشنا تھے۔

۱۳۔اسلامی تاریخ،تہذیب اور تمدن پر گہری نگاہ تھی۔

۱۴۔مذہبی علوم کے عالم وفاضل تھے۔

۱۵۔ادب وانشا کی تعلیم اپنے عہد کے سب سے بڑے ادیب سے حاصل کی تھی۔

۱۶۔طب پر بھی نگاہ تھی۔

۱۷۔تصوف سے بھی آشنا تھے۔

۱۸۔لسانیات پر بھی نظر تھی۔

۱۹۔ہندوستانی تہذیب وتمدن کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

۲۰۔یہود ونصاریٰ اوران کے مذاہب کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

۲۱۔عمرانیات سے بھی کسی قدر واقف تھے۔

۲۲۔فن شاعری سے کما حقہ واقف تھے۔

۲۳۔عقلیات پر بھی نگاہ تھی۔

مذکورہ علوم اور تہذیب وتمدن سے جو شخص واقف ہو، وہ یقیناً بلند پایہ ادیب،نقاد اور انشا پرداز ہوگا اور بلا شبہ مولانا عبدالسلام ندوی کی تحقیقات وتالیفات اور مقالات اس کے شاہد ہیں کہ وہ مذکورہ علوم وافکار اور تہذیبی قدروں سے بخوبی واقف تھے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے ممتاز ترین ادیب وانشا پرداز تھے۔مولانا سعید انصاری جوان کے ہم عصر بھی ہیں اور رفیق بھی برسوں رہے۔ان کی جامعیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ’’ایک ہمہ دان عالم،فلسفی مزاج مصنف، قادرالکلام انشا پرداز کی حیثیت سے مولانا کے رشحات قلم نے علم وفن کے ہر شعبہ کو سیراب کیا ہے۔ الٰہیات،عقلیات،عمرانیات،نفسیات،تفسیر،شان نزول،حدیث،فقہ،

اصول،علم اسرارالدین ،فلسفہ منطق ،کلام،تاریخ ،سیرت ،اسماءالرجال ، فلسفۂ تاریخ ، فلسفۂ مذہب ، سائنس ، معانی ، بیان ، بدیع ،عروض ،تنقید، خطابت ، شاعری ،غرض علوم قدیمہ وجدیدہ کی تینوں شاخوں یعنی فنون حکمیہ ، دینیہ اورادبیہ میں سے بہ استثنار ریاضی وطب کون سی شاخ ہے جس میں ان کا قلم رواں نہیں ہے؟ اپنے جامع الکمالات استاذ علامہ شبلی نعمانی کی طرح وہ بھی اکثر علوم کے چمن آرا ہیں ،اگر اسوہ صحابہؓ اور سیرت عمر بن عبدالعزیز اسلامی کتب خانوں کی زینت بن سکتی ہیں تو انقلاب الامم کو بین الاقوامی ادب کی الماریوں میں بے تکلف سجایا جاسکتا ہے!‘‘(۴)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اسے مبالغہ قرار دیا ہے۔(۵)ممکن ہے اس میں کسی قدر مبالغہ ہولیکن اس میں سرے سے حقیقت اورصداقت نہ ہواسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔مولانا عبدالماجد دریابادی کا دل شاید مولانا عبدالسلام ندوی کے متعلق صاف نہ تھا۔انہیں کی رپورٹ پر ان کی دو کتابیں دلائل الفرقان اور اعجاز القرآن شائع نہ ہوسکیں اور انہوں نے اپنی کتاب معاصرین میں ان کا سرے سے ذکر نہیں کیا،اس لئے ان کی آراء سے اعتبار واتفاق سے درگذر بھی کیا جاسکتا ہے۔البتہ مولانا عبدالسلام ندوی کی تصنیفات وتالیفات ،تراجم اورمقالات کے مطالعہ وتجزیہ کے بعد مولانا سعید انصاری کے آراء وخیالات درست معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال ایک ادیب و انشاپرداز کے لئے جن امتیازات وخصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب مولانا عبدالسلام ندوی کی ذات میں مجتمع ہوگئے تھے۔مولانا سعید احمد اکبرآبادی[۱۹۰۸-۱۹۸۵ء] نے سچ لکھا ہے کہ:

’’ان کا سب سے بڑا وصف اور کمال جس میں مشکل ہی سے کوئی ان کا حریف ہوگا یہ تھا کہ وہ صرف ایک نامور مصنف، ادیب اور نقد سخن کے بہترین جوہری تھے۔ اس حیثیت سے وہ لیلائے علم و ادب کو مخاطب کرکے بجاطور پر کہہ سکتے ہیں:

سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا(۶)

حواشی

(۱) مقالات عبدالسلام ص۱۶۴-۱۶۵

(۲) عبدالسلام ندوی۔ معارف جولائی ۱۹۱۶ء، ص۲۰/-۲۱

(۳) شعرالہند جلد دوم، ص۲۹۲

(۴) مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں۔ ص۲۶-۲۷

(۵) کبیر احمد جائسی کی علمی وادبی خدمات ص۲۱۰)

(۶) ماہنامہ برہان نومبر ۱۹۵۶ء، ص۲۵۹)

شاعری

مولانا عبدالسلام ندوی اقلیم سخن کے بھی تاجدار تھے۔ البتہ ان کے نثری کارناموں کی عظمت ومقبولیت کے آگے ان کے شاعری ماند پڑ گئی، حالانکہ ان کی زندگی کا آغاز شعروشاعری سے ہوا۔ خود لکھا ہے کہ کان پور، آگرہ اور غازی پور میں تعلیمی سلسلے کے علاوہ کچھ ادبی مشاغل بھی جاری تھے۔ (۱)

تحصیل علم کے لئے کان پور میں وہ اپنے عزیز محبوب الرحمٰن کلیم کے ساتھ رہے۔ کلیم صاحب شعروسخن کا بہت عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ وہ کان پور کے مشاعروں میں شریک ہوتے اور داد سخن دیتے۔ ان کی صحبت میں مولانا عبدالسلام ندوی کا ذوق شعروادب بیدار ہوا، چنانچہ انھوں نے طبع آزمائی شروع کی اور کلیم صاحب سے اصلاح لینے لگے اور انھیں سے متاثر ہوکر شمیم تخلص اختیار کیا۔ محبوب الرحمٰن کلیم نے ایف۔ اے۔ پاس کرنے کے بعد بی۔ اے۔ کے لئے آگرہ کا رخ کیا تو مولانا بھی ان کے ہمراہ آگرہ پہونچے اور مولوی رمضان سے تعلیم حاصل کی۔

آگرہ شعروادب کا قدیم مرکز رہا ہے۔ اس وقت بھی گہوارۂ ادب بنا ہوا تھا۔ متعدد استاذ شعرا مثلاً مرزا خادم حسین رئیس، بزرگ علی عالی اور واصف حسین واصف وغیرہ کی سخن طرازیوں سے آگرہ کی فضا پرشور تھی۔ کلیم صاحب بہت جلد یہاں کے حلقۂ شعروادب میں روشناس ہوگئے۔ ان کے ساتھ مولانا عبدالسلام ندوی بھی مشاعروں میں شریک ہوکر اپنا کلام سناتے۔ ایک مشاعرے میں یہ شعر پڑھا:

مرگیا ہوں یہ کس غیرت چمن کیلئے
کہ لائیں چادر گل بلبلیں کفن کیلئے

تو مرزا خادم حسین رئیس نے زبردست داد دی۔ آگرہ کے مشاعروں میں بعض اور

اشعار کو بھی بہت سراہا گیا۔ ان میں دو شعر یہ بھی ہیں:

چار سو مجھ کو شب و روز لئے پھرتی ہے
اک ہنڈولا اسے کہئے مری وحشت کیسی

بھیک کے دینے کو در پر وہ نکل آئیں
اے حضرت دل درد بھری ایسی صدا ہو

بی.اے. کے بعد مولوی محبوب الرحمٰن کلیم جیراج پوری نے علی گڑھ کا رخ کیا اور مولانا عبدالسلام ندوی چشمہ رحمت غازی پور گئے،۔ اس وقت چشمہ رحمت کے منیجر عبدالاحد شمشاد لکھنوی جو خوش فکر اور قادرالکلام شاعر تھے، غازی پور کے شعرا کا مرکز توجہ تھے اور شعراء انھیں سے مشورہ سخن کر رہے تھے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی ان سے باقاعدہ اصلاح لی اور ان کے کتب خانہ سے جس میں قدیم شعرا کے دواوین کا بڑا ذخیرہ تھا بھرپور استفادہ کیا۔ اس طرح یہاں بھی ان کے شعری ذوق کو بڑی جلا ملی۔ شمشاد لکھنوی نے ان کے اس شعر کی بڑی تعریف کی:

بدگمانی سے انھیں میری نظر وہ سمجھے
چمکے ذرے بھی اگر روزن دیوار کے پاس

غازی پور کے بعد وہ ندوہ لکھنؤ پہونچے۔ اس دور آخر میں بھی لکھنؤ کی بہار کسی قدر قائم اور فضا سخن سنجیوں سے پرشور تھی۔ خاص ندوے میں بھی متعدد طلبہ مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی، عبدالغفور شرر، حکیم رکن الدین دانا وغیرہ مشق سخن کر رہے تھے اور سب سے بڑھ کر علامہ شبلی جیسے شہرۂ آفاق ادیب و شاعر کی صحبت نے مولانا کے آتش شوق کو شعلہ بنا دیا۔

لکھنوی شعراء میں مولانا عبدالسلام ندوی، ضامن علی جلال لکھنوی سے بہت متاثر ہوئے اور ان سے اصلاح لینی چاہی، مگر وہ بغیر نذرانہ لئے اصلاح نہیں دیتے تھے اور طالب علمی میں مولانا اس کے متحمل نہیں تھے، اس لئے جلال لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل نہ کر سکے۔ تاہم جلال سے ان کی عقیدت کبھی کم نہ ہوئی۔ ان کے کلام کا مطالعہ وہ برابر کرتے رہے۔ شعرالہند میں بھی ان کا تذکرہ کیا اور پھر علاحدہ ایک طویل مقالہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے رسالہ ''تماہی

ہندوستانی‘‘ میں لکھ کر ان کے شعری کمالات کو اجاگر کیا۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے امیر مینائی سے بھی مشورہ سخن کیا اور چند غزلیں انھیں دکھائیں جو ان کے رسالہ دامن گلچیں میں شائع ہوئیں۔

ندوہ کے بعد وہ اپنے دوست مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال سے وابستہ ہوئے، کلکتہ بھی اس وقت شعر و ادب کا ایک مرکز تھا۔ شہر میں متعدد شعراء کی محفلیں شعر و ادب کی جان بنی ہوئی تھیں۔ یہاں کے بعض مشاعروں میں بھی مولانا نے اپنا کلام سنایا۔ ایک مشاعرے میں یہ شعر پڑھا

خشک وتر اور بحروبر کی جب ہوئی قسمت
مزاج خشک زاہد کو ملا ، دامان تر ہم کو

تو رضا علی وحشت کلکتوی [۱۸۸۱-۱۹۵۶ء] نے بڑی تحسین کی۔

علامہ شبلی کی وفات کے بعد ان کے ادھورے علمی کاموں کی تکمیل کے لئے مولانا عبدالسلام ندوی اعظم گڑھ آئے اور دارالمصنّفین اور اس کے مقاصد کی تکمیل کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، اس وقت اعظم گڑھ کی ادبی زمین بھی آسمان بنی ہوئی تھی۔ اقبال سہیل، مرزا احسان اور دوسرے مقامی شعرا کی زمزمہ سنجیوں سے محفلیں گرم اور پرشور رہتی تھیں۔ دارالمصنّفین کی علمی فضا بھی مولانا سید سلیمان ندوی، سعید انصاری نشتر، ابوالحسنات ندوی نیّر [ف: ۱۰ر نومبر ۱۹۲۴ء] مرزا احسان احمد اور یحییٰ اعظمی کی نوا سنجیوں سے پرشور تھی۔ جگر، اصغر، سجاد انصاری اور بعض دوسرے شعرا کی آمد سے شہر سخن کی رونق اور بڑھ جاتی تھی۔ ایسے ماحول میں کم گوئی کے باوجود مولانا عبدالسلام ندوی نے خوب طبع آزمائی کی، مولانا سید سلیمان ندوی ان کے شعر و سخن کے بڑے مداح اور قدرداں تھے۔ اس دور میں ان کی متعدد اردو اور فارسی غزلیں ماہنامہ معارف میں شائع ہوئیں۔ ان کی ایک غزل شائع کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا کہ:

> ’’شاید یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہمارے فاضل دوست مولانا عبدالسلام ندوی ایک قادرالکلام شاعر بھی ہیں۔ شاعری پر ان کی تنقیدیں ناظرین کی نگاہوں سے اکثر گذری ہوں گی۔ وہ شاعری کے رموز و نکات پر نہایت اچھی نظر رکھتے ہیں۔ بیشتر اردو اور کبھی فارسی میں کہتے ہیں، لیکن

شاعر کی حیثیت سے پبلک میں آنا انھوں نے ہمیشہ ناپسند کیا۔ اب ہمارے اصرار اور استاذ مرحوم کی تقلید سے مجبور ہو کر وہ ایک تازہ فارسی غزل ہدیہ ارباب نظر کرتے ہیں۔'' (۲)

بعض مقامی طرحی نشستوں میں بھی مولانا نے اپنی غزلیں سنائیں۔ ایک طرحی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نشہ میں ہیں کبھی تو کبھی ہیں خمار میں — اچھی گذر رہی ہے ترے انتظار میں
چپ چاپ بھی نہ بیٹھ سکے بزم یار میں — مجبوریاں بھی غیر کے تھیں اختیار میں
لاکھوں قفس ہیں لائے گی کس کس میں بوئے گل — چڑھنے لگے گی سانس صبا کی بہار میں

اس طرحی نشست میں اقبال سہیل نے بھی اپنی غزل پیش کی تھی جس کے تین شعر یہ ہیں

اف کیا مزا ملا ستم روزگار میں — کیا تم چھپے تھے پردہ لیل و نہار میں
سو سجدے ایک لغزش مستانہ وار میں — اللہ کیا ادا ہے ترے بادہ خوار میں
اچھی نہیں ہے گرم روی اس دیار میں — میں چھپ گیا خود اپنے اٹھائے غبار میں

ایک بار سجاد انصاری اور مولوی فضل الرحمٰن وغیرہ شعراء دارالمصنّفین آئے تو شبلی منزل میں شعر و سخن کی مجلس آراستہ ہوئی، جس میں مہمان شعراء کے ساتھ مقامی شعراء نے بھی اپنے دو-دو منتخب اشعار سنائے۔ اس موقع پر مولانا عبدالسلام ندوی نے مندرجہ ذیل اشعار سنائے:

مری نگاہ میں اسرار عشق ہیں پنہاں
کہ تم سے کی ہے اشاروں میں گفتگو برسوں

صیاد و باغباں کی بھی پڑتی نہیں نگاہ
بگڑی ہوئی یہ شکل مرے آشیاں کی ہے

مولانا نے اعظم گڑھ کے بعض مشاعروں کی صدارت بھی کی۔ ایک مشاعرے کے خطبہ صدارت میں انھوں نے غزل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ خطبہ ان کے ادبی مضامین کے مجموعہ مقالات عبدالسلام میں شامل ہے۔ غزل کی حمایت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے

مگر حمایت میں مولانا نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے زیادہ مدلل تجزیہ اردو میں مشکل ہی سے ملے گا۔ اس کا مطالعہ آج بھی افادیت سے خالی نہیں۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی آخری غزل انتقال سے چند روز پہلے لکھی تھی جو ان کے انتقال کے بعد ان کے جیب سے ملی تھی، گویا مولانا آخر تک زلف غزل ہی کے اسیر رہے مگر چونکہ وہ کم گو تھے اور محض تفنن طبع کے لئے شعر کہتے تھے، اس لئے ان کا سرمایہ سخن بہت مختصر بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ محض چند غزلیں اور کچھ اشعار محفوظ ہیں۔ تلاش بسیار کے باوجود مزید ان کا کلام دستیاب نہ ہوسکا۔ ان کا ایک مجموعہ کلام تھا جو مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے پاس تھا، اس سے انھوں نے اپنے مضمون [مطبوعہ ماہنامہ معارف جنوری ۱۹۵۷ء] میں اشعار نقل کئے تھے۔ مگر اب وہ کہیں دستیاب نہیں۔

مولانا مرحوم کی زندگی میں ان کے ایک شاگرد پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم نے ان کی شاعری پر ایک مضمون ماہنامہ ’آجکل‘ دہلی [دسمبر ۱۹۵۶ء] میں لکھا تھا، جس میں ان کے اشعار کے متعدد نمونے نقل کئے تھے۔ مولانا نے اپنی ابتدائی غزلیں پیام یار اور دامن گل چیں وغیرہ میں اشاعت کے لئے بھیجی تھیں، ان کی فائلیں راقم کو دستیاب نہ ہوسکیں۔ مجموعی طور سے ماہنامہ معارف کی غزلیں، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور پروفیسر کبیر احمد جائسی کے نقل کردہ اشعار مولانا کے کلام کی کل کائنات ہے۔ اور یہ کائنات ان کے پختہ مشق شاعر اور بہترین غزل گو ہونے کی شہادت دیتا ہے۔

ان کی غزلوں کی تفہیم اور ان کے شاعرانہ کمالات کے پرکھنے کے لئے ضروری ہے کہ شاعری کے سلسلے میں ان کے آراء و خیالات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ مولانا دہلی کے مقابلہ میں لکھنوی شاعری کے دلدادہ تھے۔ اس کا اصلاح شدہ رنگ انھیں بہت پسند تھا اور اسی کو وہ اصل شاعری قرار دیتے تھے۔ البتہ دوسرے نقادوں کی طرح وہ بھی لکھنوی ابتذال، رکاکت اور سوقیانہ پن کو ناپسند کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جلال لکھنوی ان کے محبوب شاعر ہیں اور خود انھوں نے اسی رنگ میں طبع آزمائی کی۔ پاکیزہ جذبات واحساسات، متین اور سنجیدہ فکر و خیال کو وہ شاعری کا لازمہ خیال کرتے تھے اور انھیں کی ترجمانی انھوں نے اپنے اشعار میں کی ہے۔ پاکیزہ عشق ومحبت،

واردات قلبی، ہجر وفراق، شیفتگی و وارفتگی ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔فنی لحاظ سے بھی انھوں نے اپنی غزلوں کو معیار و وقار عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ غزل کا بنیادی وصف تغزل قرار دیتے ہیں۔ان کی غزلوں کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

چہرے تک ان کے مست گئی بے خبر گئی
جب جب گئی نگاہ بنوع دگر گئی

گو جس کی جستجو تھی وہ یوسف نہیں ملا
لیکن مری نگاہ سے دنیا گذر گئی

قیس کے ہمراہ لیلیٰ بھی مگر منزل میں ہے
اضطراب دل کا عالم جنبش محمل میں ہے

مجھے خلوت میں ان سے راز سوز عشق کہنا ہے
ا لگ کچھ دیر کو اب شمع سے پروانہ ہوجائے

چلو جنت میں شغل ساغر و پیمانہ ہوجائے
جگہ پرلطف ہے اک صحبت رندا نہ ہوجائے

لگی ہے غیر کی تصویر در سے
بتاؤ اب کہ میں آؤں کدھر سے

یہ مے آج دم کرکے واعظ نے دی ہے
حرام اس کو سمجھیں نہ میخانے والے

مولانا کے بعض اشعار داغ و امیر کے شوخ رنگ میں بھی ہیں مگر یہ ان کا عام رنگ شاعری نہیں:

ہے کہ در پردہ نیت زاہد
شریک صحبت رندان بادہ خوار میں ہیں
تقدیر ایسی چاندنی میں
جو چمکے گی تو تم سے مہ جبیں سے

تو ہاتھ تو رکھ دے کسی کے روئے روشن پر
مرا ذمہ جو اے زاہد ید بیضا نہ ہوجائے

مولانا کی ایک غزل غالب کے رنگ و بحر میں بھی ہے:

جہاں دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں   فقط اک فریب نظر دیکھتے ہیں
انھیں دیکھنے کی کہاں راہ نکلی   ابھی تک تو دیوار و در دیکھتے ہیں
نظر باز بن کر شمیم اس گلی میں   تماشائے اہل نظر دیکھتے ہیں

یہ محض غالب کا تتبع ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور، اور مولانا کا اور۔ البتہ مذکورہ اشعار میں پہلا شعر خاص طور پر قابل توجہ ہے۔

غالب نے ایک صدی قبل جو کچھ کہا تھا مولانا کے اشعار اس کی گرد کو بھی نہیں پہونچتے لیکن یہ خود ایک بڑی بات ہے کہ لکھنوی شاعری کے ایک دلدادہ کو مرزا غالب کے رنگ میں طبع آزمائی کا خیال آیا۔

مولانا کے معاصر شعرا اقبال سہیل، مرزا احسان احمد وغیرہ شعری ادب میں بلند رتبہ ہیں، جس طرح نثری ادب میں مولانا کے معاصرین ان کے ہم پلہ نہیں، اسی طرح خود مولانا شعری ادب میں ان کے مساوی مرتبہ کے مالک نہیں، تاہم اقبال سہیل ان کے بڑے ناقد تھے بالخصوص مولانا کے لکھنوی مذاق شعر و شاعری کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔ باوجود اس کے انھوں نے مولانا کے مندرجہ ذیل اشعار کی بھرپور داد دی:

شاخوں پہ نظر ڈالی ایک ایک شجر دیکھا
صیاد نے گلشن میں شاید کوئی پر دیکھا

یوسف کو سستے دام زلیخا نے لے لیا
تقدیر تھی کہ حسن کی قیمت ٹھہر گئی

دیکھ لو ایک نظر دیر و حرم کی جانب
دو ہی گھر اور تو مٹنے کو ہیں ویراں ہوکر

دورجدید کے نقادوں نے ادبی جائزوں میں شاعر کی نفسیات کے تجزیئے کوضروری قراردیاہے۔مولانا کی تصنیف شعرالہند پر بابائے اردومولوی عبدالحق،کلیم الدین احمد اور نیاز فتح پوری وغیرہ نے اسی بنیاد پرتنقید کی ہے۔اگراس لحاظ سے مولانا کے کلام پرنظرڈالی جائےتوان کی بےنفس زندگی اوران کی بےخودی ووارفتگی کی تصویربھی ان کے کلام میں دکھائی دیتی ہے:

سامان کیا زیارت صحرا کے واسطے
چادر لپیٹ لی کبھی عریاں نکل پڑے

زبان بے زبانی ہم سے بڑھ کر کون سمجھے گا
تری تصویر سے فرقت میں کی ہے گفتگو برسوں

مولاناقدیم طرزسخن کے دلدادہ تھے۔موضوع،مواد،ہیئت،ترکیب،ردیف،قافیہ غرض قدیم سانچوں کووہ پسند کرتے تھے۔چنانچہ انھوں نے انھیں قدیم اصولوں کواپنی غزلوں میں برتنے کی کوشش کی،وہ جدیدلب ولہجے سے ناآشناہونے کے باوجوداس کوپسندنہیں کرتے تھے۔خاص طور سےترقی پسند شاعری کوتغزل،لطافت،رنگینی اورکیف واثر سے عاری قرار دیتے تھے۔ان کے نزدیک فن کی پابندی اورزبان کی صحت وصفائی لازمہ شاعری ہے۔یہی وجہ ہے کہ خودان کی غزلوں میں جدیدرنگ کا کوئی نشان نہیں ملتا،حتیٰ کہ قومی شاعری جس کے آغاز کاسہراان کے استاذ علامہ شبلی کے سر ہے،اس کا ذرہ برابر پرتو بھی ان کی شاعری میں کہیں نظرنہیں آتا۔مجموعی طور سے مولانا کی

شاعری اگرچہ تفنن طبع کی شاعری معلوم ہوتی ہے تاہم قدیم رنگ تغزل، سنجیدہ، متین اور پاکیزہ جذبات واحساسات کے دلدادگان کے لئے مولانا کی شاعری میں یقیناً کیف واثر کا سامان ہے۔

حواشی

(۱) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ۱۱۶

(۲) معارف، فروری ۱۹۱۹ء۔ص ۴۴۴

مکتوب نگاری

مولانا عبدالسلام ندوی کے مکتوبات کا اب تک مطالعہ نہیں کیا گیا بلکہ سرے سے اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی حالانکہ ان میں بہت سے علمی وادبی مسائل کا ذکر ہے اور خود ان کی سوانح زندگی کے کئی اہم پہلو اس میں آگئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی کی سوانح حیات ہی کی طرح ان کے مکتوبات کی تدوین بھی ایک مدت کے بعد ہوئی۔ یہ کام مشہور عبدالسلام شناس پروفیسر کبیر احمد جائسی نے مولانا کے پچاس سالا یوم وفات کے موقع پر ۲۰۰۶ء میں انجام دیا اور ''مکاتیب واشعار مولانا عبدالسلام ندوی'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ جسے مولانا عبدالسلام ندوی فاونڈیشن ممبئی نے شائع کیا ہے۔ اس میں بیشتر حصہ مکاتیب کا ہے، نسبتاً حصہ اشعار مختصر ہے۔ البتہ اس میں ان کے تمام دستیاب مکاتیب واشعار شامل ہیں۔ اس میں ۱۰/ مکتوب الیہ کے نام ۴۷/خطوط شامل ہیں۔ مکتوب الیہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

[۱]مولوی مسعود علی ندوی، ۲/خط [۲]مولانا سید سلیمان ندوی، ۱/خط [۳] سید عبدالحکیم دسنوی، ۱/خط [۴] نواب سید شمس الحسن، ۱/خط [۵] ڈاکٹر سید عبداللہ، ۸/خط [۶] مولانا ابوالکلام آزاد، ۱/خط [۷]مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، ۱۱/خط [۸] مولانا عبدالماجد دریابادی، ۲۰/خط [۹] مولوی عبدالباری، ۱/خط [۱۰] نامعلوم الاسم، ۱/خط۔

مولانا عبدالسلام ندوی کا سب سے قدیم دستیاب خط ۲۵/جولائی ۱۹۱۳ء کا ہے اور آخری خط ۱۱/جنوری ۱۹۵۶ء انتقال سے چند ماہ پیشتر کا ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ہے۔ یہ خط مولانا آزاد کے سکریٹری محمد اجمل کی مرتب کردہ کتاب ''مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط وجوابات'' شائع کردہ سنگم کتاب گھر دہلی [۱۹۶۶ء] سے ماخوذ ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی متعدد اہل علم سے خط وکتابت کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں ان

کے قابل فخر استاذ علامہ شبلی نعمانی کی ذات گرامی بھی شامل ہے مگر ان کے نام کا کوئی خط اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح دوسرے اہل علم کے نام کے بھی خطوط دستیاب نہ ہو سکے، حالانکہ پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم نے اس سلسلہ میں کافی تگ ودو کی جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی ۴۷ رسالہ علمی زندگی میں محض ۴۷ رخطوط کا دستیاب ہونا یہ اس بات پر دلالت ہے کہ ان سے اہل قلم نے صرف نظر کیا اور ان کے خطوط کی طرف خاطرخواہ توجہ نہیں دی گئی۔

پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم کو اہل علم بالخصوص ارباب دارالمصنّفین سے مولانا عبدالسلام ندوی سے عدم التفات کا شکوہ رہا۔ انھوں نے موقع بے موقع اس طرز عمل کا ذکر کیا ہے۔ البتہ بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے پوری زندگی مولانا عبدالسلام ندوی کی حیات وخدمات سے سروکار رکھا۔ اس کا آغاز انھوں نے مولانا کی زندگی میں ان پر ایک مضمون لکھ کر کیا جو ان کی وفات کے بعد ماہنامہ آج کل دہلی [دسمبر ۱۹۵۶ء] میں شائع ہوا۔ انہی کی کوششوں سے ۱۹۵۸ء میں شبلی کالج میگزین کا عبدالسلام نمبر شائع ہوا۔ پھر انہوں نے ۱۹۶۱ء میں ماہنامہ ادیب علی گڑھ کا عبدالسلام نمبر ذکر عبدالسلام نکالا۔ دو مقالے لکھوائے۔ ڈاکٹر غضنفر نے انگریزی میں ایم،فل کا مقالہ لکھا جو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے شائع ہوا۔ دوسرا مقالہ اردو میں ڈاکٹر شباب الدین نے ''عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات'' کے نام سے پی ایچ ڈی کے لئے لکھا۔ یہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ برسوں بعد انھوں نے ساہتیہ اکادمی دہلی کے سلسلہ ادب کے معمار کے تحت مولانا عبدالسلام ندوی پر مونوگراف تیار کیا جسے ساہتیہ اکادمی دہلی نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔

مولانا عبدالسلام ندوی کے بعض قرابت داروں نے ممبئی میں ایک شاندار سمینار کر کے مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن کی بنیاد ڈالی جس میں ہارون اعظمی صاحب پیش پیش تھے۔ اور جو آج فاونڈیشن کے روح رواں ہیں پروفیسر جائسی نے اس کی ترقی کی منصوبہ بندی میں شامل ہو کر اسے ایک ادارہ کی شکل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے کئی سمینار منعقد کئے اور مولانا عبدالسلام ندوی پر کئی کتابیں شائع کیں۔ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر کبیر احمد جائسی نے مولانا عبدالسلام ندوی کے کئی طویل مقالات کو کتابی صورت میں شائع کرایا اور خود اپنی کتاب ''مکاتیب و

اشعار مولانا عبدالسلام ندوی'' بھی شائع کی۔ یہ محض ۴۷ خطوط کا مجموعہ ہونے کے باوجود بہت اہم ہے۔اس کے مکتوب الیہ اوران سے مولانا عبدالسلام ندوی کے روابط کی تفصیل یہ ہے:

۱-مولوی مسعود علی ندوی:

مولوی مسعود علی ندوی معمار دارالمصنّفین علامہ شبلی کے تلمیذ خاص اور مولانا عبدالسلام ندوی کے خاص احباب میں تھے۔قصبہ بھیارہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۰۴ء میں ندوۃ العلماء آئے اور ۱۹۱۰ء میں سند فراغت حاصل کی۔علامہ شبلی نے دارالمصنّفین قائم کیا تو ان کے تلامذہ میں مولوی مسعود علی ندوی سب سے پہلے اعظم گڑھ آئے۔اوراس کا نظم وانتظام سنبھالا۔۱۹۶۴ء میں دارالمصنّفین ہی میں وفات پائی۔میاں بیوی دونوں دارالمصنّفین کے قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی ان سے خط وکتابت دارالمصنّفین آنے سے پہلے کی ہے۔ ان کے نام کوئی مکمل خط دستیاب نہیں ہوا ہے بلکہ دو خطوط کے چھوٹے چھوٹے اقتباسات ملے ہیں جو ندوہ کے زمانہ قیام کے ہیں۔مذکورہ اقتباسات ان خطوط کے ہیں جو ندوہ کی اسٹرائک سے پہلے لکھے گئے ہیں۔علامہ شبلی کی حمایت میں ندوہ کی اسٹرائک کی قیادت مولوی مسعود علی ندوی ہی نے کی تھی۔مولانا عبدالسلام ندوی کا وہ خط انہی کے نام تھا جس پر ارباب ندوہ نے بڑا واویلا مچایا تھا اور جس کی بنیاد پر اسٹرائک کا ذمہ دار علامہ شبلی کو قرار دیا تھا۔ یہ خط اس زمانہ میں بعض اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا مگر مکمل خط فاضل مرتب کو دستیاب نہ ہوسکا۔

۲-مولانا سید سلیمان ندوی

علامہ شبلی کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی کے خاص احباب میں تھے۔علامہ شبلی کی وفات کے بعد ان کے منصوبوں کی تکمیل میں دونوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دارالمصنّفین میں بھی ساتھ ساتھ رہے۔مولانا عبدالسلام ندوی کا محض ایک خط ان کے نام دستیاب ہے جو انہوں نے کلکتہ سے لکھا تھا۔

۳-سید عبدالحکیم دسنوی

یہ دیسنہ ضلع پٹنہ کے رہنے والے اور علامہ شبلی کے احباب اور معتقدین میں تھے۔ندوہ کی اسٹرائک کے زمانہ میں انھوں نے علامہ شبلی کی تائید میں زمیندار لاہور میں مضمون لکھا تھا۔اس میں انھوں نے اس قضیہ کو حکومت تک پہنچانے کی ذمہ داری مولانا شبلی کے سر ڈالی تھی، مولانا عبدالسلام ندوی نے خط لکھ کر اس سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''میں نے زمیندار میں آپ کا مضمون پڑھا۔خوشی کے ساتھ تعجب بھی ہوا، اس لئے کہ اس شور وغل میں آپ پہلے شخص ہیں جس نے مولانا (شبلی) کی حمایت کی۔تعجب اس لئے ہوا کہ آپ نے بھی اس معاملے کو گورنمنٹ تک پہنچانے کا ذمہ دار مولانا کو قرار دیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دفتر نظامت اور صیغہ تعلیمات دو الگ چیزیں ہیں۔ دفتری نظامت کے سکریٹری مولوی عبدالحی صاحب ہیں، جو تحریر صاحب ڈپٹی کمشنر کو بھیجی گئی، وہ ایک مجلس کی مرتب کردہ تحریر تھی۔اس پر تینوں معتمدین مولوی عبدالحی، منشی احتشام علی اور مولانا شبلی کے دستخط تھے۔پھر مولانا اس کے تنہا ذمہ دار کیسے ہو سکتے ہیں، صیغہ تعلیمات سے اس کو تعلق نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایڈیٹر الناظر ایک لوکل آدمی ہے، اس کو وہ تمام واقعات معلوم ہیں جن کا تعلق منشی احتشام علی سے ہے۔منشی احتشام علی برابر ڈپٹی کمشنر سے ملتے رہے۔ ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں جو تحریر بھیجی گئی، اس پر ان کے دستخط تھے، لیکن چوں کہ وہ ان کا نہایت قریبی عزیز ہے، اس لئے وہ تمام مضامین میں ان کا نام بھی نہیں لیتا۔اور تمام ذمہ داری مولانا کے سر ڈالتا ہے تو کیا یہ اس کا فعل نیک نیتی پر مبنی ہے۔آپ خاص اس پوائنٹ پر لکھئے اور اس کی بد دیانتی کا اظہار کیجئے۔''(۱)

۴-نواب سید شمس الحسن

یہ نواب سید صدیق حسن خاں کے پورتے اورنواب سید علی حسن خاں[۱۸۶۶ - ۱۹۳۶ء] کے صاحبزادے ہیں۔مولانا عبدالسلام ندوی نے انھیں جوخط لکھا ہے وہ دراصل نواب سید علی حسن خاں کی وفات پرتعزیت نامہ ہے۔

۵-ڈاکٹر سید عبداللہ

ممتاز ادیب ونقاد ڈاکٹر سید عبداللہ[۱۹۰۴-۱۹۸۶ء] ایک بڑے شبلی شناس بھی تھے۔مولانا عبدالسلام ندوی نے اقبال کامل کی تصنیف کے زمانہ میں ان سے خط وکتابت کی۔ان کے نام بیشتر خطوط میں مصادر اقبال کامل کا ذکر ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے اقبال کامل کی تصنیف میں مصادر وماخذ کی تلاش میں بڑی تگ ودو کی۔

۶-مولانا ابوالکلام آزاد

ندوہ کی زمانہ طالب علم ہی میں مولانا آزاد سے ان کے روابط قائم ہوگئے تھے جو اخیر تک باقی رہے۔ماہنامہ الندوہ کی ادارت کے بعد مولانا آزاد نے انہیں الہلال کے لئے کلکتہ بلالیا۔علامہ شبلی کی وفات اور الہلال کے بند ہوجانے کے بعد دارالمصنّفین قائم ہوا تو وہ دارالمصنّفین آ گئے۔یقیناً ان کے نام اور بھی خطوط رہے ہوں گے مگر وہ دستیاب نہ ہوسکے۔مولانا عبدالسلام ندوی کا آخری دستیاب خط انہیں کے نام ہے،اس سے بھی دونوں کے محبت آمیز اور بے تکلفانہ تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

۷-مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اہل قلم،مصنف،شاعر اورتحریک ندوہ کے ممتاز لوگوں میں سے تھے۔ان سے خورد وبزرگ کا تعلق تھا۔ان کے نام مولانا عبدالسلام ندوی کے کچھ خطوط

اس زمانہ کے ہیں جب وہ ماہنامہ الندوہ کے سب ایڈیٹر تھے۔ اس میں انھوں نے الندوہ کے لئے مضامین کی فرمائش کی ہے۔ کئی خطوط یاددہانی کے طور پر لکھے ہیں۔ واضح رہے کہ مولانا شروانی ماہنامہ الندوہ کے سینئر مدیر تھے اور ان کا نام ٹائٹل کور پر علامہ شبلی سے پہلے آتا تھا۔

دوسری بار خط وکتابت اس زمانہ میں ہوئی ہے جب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر اور مولانا عبدالسلام ندوی دارالمصنّفین کے رفیق تھے اور شروانی صاحب کی فرمائش پر انھوں نے التربیۃ الاستقلالیہ کا اردو ترجمہ کیا تھا جسے کانفرنس نے ۱۹۲۶ء میں اہتمام سے شائع کیا۔ فلسفۂ تعلیم اور اولاد کی تعلیم وتربیت پر یہ ایک بڑی عمدہ کتاب ہے۔

۸-مولانا عبدالماجد دریابادی

جن لوگوں کو علامہ شبلی سے نسبت پر فخر تھا ان میں ایک اہم نام مفسر قرآن اور ادیب شہیر مولانا عبدالماجد دریابادی کا بھی ہے۔ اسی نسبت سے مولانا عبدالسلام ندوی سے ان سے مراسم رہے۔ دارالمصنّفین جب قائم ہوا تو جو اہم لوگ اس کے رکن نامزد ہوئے ان میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام بھی شامل ہے۔ وہ دارالمصنّفین کے بعد میں صدر بھی ہوئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی عدم موجودگی میں انھوں نے معارف کے شذرات بھی لکھے۔ وہ دارالمصنّفین کی اشاعتی منصوبوں میں بھی دخیل تھے، اس سلسلے میں ان سے رائے بھی لی جاتی تھی۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی بعض علمی وفلسفیانہ مسائل میں ان سے مشورہ کیا ہے اور ان کے خیالات معلوم کئے ہیں۔ ان سے بعض امور میں نزاعی خط وکتابت بھی ہوئی تھی جیسا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے مگر وہ خطوط اس مجموعہ میں شامل نہیں ہیں۔ شاید مولانا دریابادی نے انہیں تلف کردیا۔

۹-مولوی عبدالباری

مولوی عبدالباری، ابوعلی اثری، اعظمی [۱۹۰۳ء-۱۹۹۳ء] دارالمصنّفین میں پروف ریڈر تھے۔ ۱۹۲۱ء میں ان کا تقرر سید صاحب کے معاون کی حیثیت سے ہوا تھا۔ مولانا عبدالسلام

ندوی کا ایک خط ان کے نام ہے جو انھوں نے علی گڑھ کے دوران سفر لکھا تھا۔ یہ واحد خط ہے جس سے ان کے کسی سفر کی اطلاع ملتی ہے۔

۱۰- نامعلوم الاسم

مولانا عبدالسلام ندوی کا ایک قدیم خط کسی نامعلوم الاسم شخص کے نام ہے جو ''مکاتیب واشعار مولانا عبدالسلام ندوی'' میں درج ہے۔ یہ ندوہ کے زمانہ قیام کا معلوم ہوتا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کے خطوط میں کئی اہم باتیں ان کی سوانح زندگی کی آ گئی ہیں، مثلاً مولانا عبدالسلام ندوی ان لوگوں میں سرفہرست تھے جنھوں نے علامہ شبلی کے ساتھ ندوہ میں ہونے والی زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کی اور ان کی حمایت میں تحریک برپا کرنے کی کوشش کی۔ کئی خطوط میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی بڑے نیک اور شریف الطبع شخص تھے، ان خطوط میں بھی ان کی شرافت اور شائستگی کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔

۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی کی وفات کے بعد مولانا حمیدالدین فراہی کے سربراہی میں اخوان الصفا کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے صدر مولانا فراہی اور سکریٹری مولانا سید سلیمان ندوی مقرر ہوئے۔ اس موقع پر مولانا عبدالسلام ندوی نے مولانا سید سلیمان ندوی کو جو خط لکھا ہے اس کا ایک ایک حرف معاصرت رکھنے والوں کے لئے تعزیانہ سے کم نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> برادر اعظم! میں نے بلا اختلاف آپ کو مولانا (شبلی) مرحوم کا خلیفہ تسلیم کرلیا ہے۔ اس لئے جس طرح میں حضرت مرحوم کا وفادار خادم تھا آپ بھی مجھے اپنا وفادار خادم تصور فرمایئے۔ میں آپ کے زیر ہدایت و زیر نگرانی ہر ممکن خدمت کے لئے تیار ہوں۔'' (۲)

پھر پوری زندگی دارالمصنّفین کی تاریخ میں کسی ایک ایسے واقعے کا ذکر نہیں ملتا جس میں انھوں نے سید صاحب سے اختلاف کیا ہو۔ انھوں نے دارالمصنّفین کے جو علمی منصوبے انہیں سپرد کر دیے اسے پورا کرنا ہی اپنا فرض خیال کیا۔

۱۹۴۴ء میں مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنّفین کے بعض اندرونی حالات سے برگشتہ ہوکر بھوپال میں دارالقضاء کا عہدہ قبول کیا اور بھوپال چلے گئے۔ اس کے بعد ماہنامہ معارف کی ادارت دوسروں کے حصے میں آئی مگر مولانا نے اف تک نہ کی۔ پھر ۱۹۴۹ء میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی دارالمصنّفین کے ناظم اور معارف کے باقاعدہ مدیر مقرر ہوئے۔ مولانا عبدالسلام ندوی ان کے ماتحت قرار پائے لیکن انھوں نے کسی طرح کی کوئی سرگرمی نہیں دکھلائی۔ ان تمام باتوں کا ذکر ان کے خطوط میں نہیں، البتہ آخری دور میں انھیں بیماریوں نے آگھیرا تھا، اس کا ایک دو خط میں ذکر ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنے مضمون ''میرے مولوی صاحب'' میں ان کے ایک مرض کا ذکر کیا ہے جس میں رنج ونشاط کی کیفیت باری باری ہوتی تھی مگر بعض لوگ ایسے بھی تھے جو ان کی دماغی صحت پر شبہ کرتے تھے۔ مولانا کو ان سے تکلیف پہنچی اور انھوں نے اپنے عزیز دوست مولانا ابوالکلام آزاد کو مفصل خط لکھا اور بعض علمی اور فلسفیانہ باتیں لکھ کر یہ بھی لکھا کہ ''غالبًا اس خط سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ میرا دماغ صحیح حالت میں ہے اور نکتہ آفرینی میں مصروف۔ یہ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ بعض لوگوں کو میری دماغی صحت پر شبہہ ہے۔(۳)

مولانا عبدالسلام ندوی کی کئی غیر مطبوعہ کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی نے ایک مقالہ میں ان کی ۷رغیر مطبوعہ کتابوں کا ذکر کیا ہے جو ان کی وفات کے وقت موجود تھیں اور ارباب دارالمصنّفین نے انھیں شائع نہیں کیا۔ چند ایک کے مکمل ونامکمل مسودے کتب خانہ دارالمصنّفین میں موجود ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی کے خطوط میں بھی ان کا ذکر ہے، البتہ چند کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا ذکر دارالمصنّفین کے ریکارڈ میں محفوظ نہیں اور نہ مولانا پر قلم اٹھانے والوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کے ایک خط میں جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ہے ایک مکمل کتاب ''اعجاز القرآن'' کا ذکر ملتا ہے جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے پاس غالبًا محاکمہ کی غرض سے بھیجی گئی تھی۔ مولانا نے خط لکھ کر اسی کو واپس مانگا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کے مکاتیب میں بحیثیت مجموعی ندوۃ العلما، ماہنامہ الندوہ اور دارالمصنّفین کے ساتھ ان کے معاصرین اور بعض بزرگوں کا ذکر بھی ہے۔ علامہ شبلی، متعلقات شبلی

اور دار المصنّفین پر کام کرنے والوں کو اس کا مطالعہ اس لئے ضروری ہے کہ یہ خطوط انہیں کی داستان کا حصہ ہیں۔

حواشی

(۱) مکاتیب و اشعار ص ۱۴-۱۵

(۲) مکاتیب و اشعار ص ۱۴

(۳) مکاتیب و اشعار ص ۲۲

غالب شناسی

مرزا غالب کی مشکل پسند طبیعت جن شعری شاہراہوں سے فاتحانہ گذری، اس کا سفر اور شعور غالب شناسی کا بنیادی حصہ ہے۔ مرزا غالب نے کہا تھا:

کچھ اور چاہئے وسعت میرے بیاں کے لئے

یہ اگر چہ انہوں نے کسی اور معنی میں کہا تھا مگر غالبیات اور لامحدود سلسلہ غالب شناسی اس بات کے شاہد ہیں کہ غالب کے یہاں کچھ اور وسعت کی امکانی صورت ابھی پوشیدہ ہے اور اسی پوشیدہ وسعت میں مولانا عبدالسلام ندوی کی غالب شناسی بھی شامل ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی اقبال کامل لکھ کر اقبال شناسی کے معماروں میں شامل ہوئے۔ لیکن انہوں نے مرزا غالب پر کوئی مستقل کتاب تو کجا کوئی مقالہ بھی نہیں لکھا ہے۔ پھر بھی وہ غالب شناسوں کی صف میں شامل ہیں کیونکہ انہوں نے مرزا غالب اور ان کے کلام کا بڑی گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا اور اس کی ارتقائی کیفیت سے واقف تھے۔ ان کی مشہور ادبی وتنقیدی کتاب شعرالہند کے اوراق اس کے شاہد ہیں۔ اس میں انہوں نے غالب کا جا بہ جا مداحانہ ذکر کیا ہے۔ غالب کی شاعری اور ان کے فکر وفلسفے پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے کلام پر نقد وجرح کی ہے۔ ان کی غزل گوئی، قصیدہ نگاری پر نقد وتبصرہ کیا ہے۔ اس کے محاسن ومعائب سے بحث کی ہے۔ ان کی عظمتوں کا اعتراف واحترام کیا ہے۔ یہ مباحث اس لائق ہیں کہ ان کا تجزیہ ومطالعہ کیا جائے اور دکھایا جائے کہ غالب شناسی میں مولانا عبدالسلام ندوی کا کیا مقام ومرتبہ ہے۔

شعرالہند بنیادی طور پر اردو شاعری کے عہد بہ عہد ارتقاء کی تنقیدی تاریخ ہے۔ ظاہر ہے اردو شاعری کی تاریخ بغیر ذکر غالب کے مکمل ہی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ مولانا عبدالسلام ندوی نے ان کا ذکر اساتذہ دہلی میں کیا ہے۔ اساتذہ دہلی میں انہوں نے شاہ نصیر، ذوق، مومن اور غالب کو

شامل کیا ہے۔ البتہ انہوں نے غالب کو اس فہرست میں سب سے اخیر میں رکھا ہے۔ غالباً یہ ترتیب زمانی ہے، ورنہ جس طرح انہوں نے غالب کی شاعری کی داد دی ہے ان کا ذکر سب سے پہلے ہونا چاہئے تھا۔

مولانا نے سب سے پہلے مرزا غالب کی شاعری میں مختلف ادوار میں جو رنگ قائم ہوئے یا جو تغیرات و انقلابات پیدا ہوئے ان کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دہلی میں ناسخ کے کلام کا غلغلہ بلند ہوا تو مرزا غالب نے وہی رنگ و روش اختیار کی۔ اس کے اثرات ان کی قدیم غزلوں میں پائے جاتے ہیں۔ بطور نمونہ مولانا نے کئی اشعار پیش کئے ہیں۔ یہاں دو شعر نقل کئے جاتے ہیں:

یوں بعد ضبط اشک پھروں گرد یار کے
پانی پیئے کسو پہ کوئی جیسے وار کے

ظاہر ہے ہم سے کلفت بخت سیاہ روز
گویا کہ تختہ مشق ہیں خط غبار کے

طرز ناسخ کے بعد مرزا غالب نے میر کا طرز سخن اختیار کیا۔ مولانا نے لکھا ہے کہ ''ان کے بعض اشعار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے میر کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کی ہے۔'' مولانا نے کئی اشعار اس کے ثبوت میں درج کئے ہیں۔ یہاں محض ایک شعر درج کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

غالب — پہلے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

میر — صبر تھا ایک مونس ہجراں
سو وہ مدت سے اب نہیں آتا

بیدل اور ناسخ کے طرز سخن کو مولانا نے گورکھ دھندے سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا خیال ہے

کہ غالب نے اس گورکھ دھندے سے نکلنے کے بعد جو طرز اختیار کیا وہ نظیری کے رنگ سے زیادہ مشابہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''لیکن درحقیقت بیدل اور ناسخ کے گورکھ دھندے سے نکلنے کے بعد انہوں نے تیموری دور کے متاخرین شعرائے فارسی کی روش اختیار کر لی، جس میں اگرچہ طالب آملی کی استعارہ طرازی اور عرفی کی جدت آفرینی اور مضمون بندی سب کچھ موجود ہے لیکن تصوف اور تغزل کی آمیزش نے اس کو نظیری کے رنگ کے مشابہ کر دیا۔''(۱)

مولانا عبدالسلام ندوی نے رنگ غالب کی جو نشاندہی کی ہے شعر الہند کا قاری خیال کر سکتا ہے کہ یہ مولانا کے مطالعہ غالب کا نتیجہ ہوگا مگر یہ واقعہ نہیں، بلکہ ان سے پہلے سخن غالب کی ان روشوں کا ذکر مولانا حالی یادگار غالب میں کر چکے تھے اور خود مرزا غالب نے بھی اپنے دیوان فارسی کے خاتمہ پر صراحتاً اس کا ذکر کیا ہے، البتہ مولانا نے کلام غالب سے جو استشہاد کیا ہے، وہ ان کے گہرے مطالعہ کلام غالب کا پرتو ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی شاعر اگرچہ بلند نہ تھے لیکن وہ اپنے عہد کے ایک بڑے سخن فہم ضرور تھے۔ ان کی سخن فہمی کی داد ارباب کمال نے دی ہے۔ شعر الہند کے مباحث اور نمونہ اشعار سے بھی ان کی بلند سخن فہمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد مولانا نے غالب کے ہم مضمون اردو فارسی اشعار نقل کر کے یہ رائے قائم کی ہے کہ مذکورہ انقلاب وتغیرات ان کی فارسی شاعری کے ساتھ اردو میں بھی آئے۔ انہوں نے مولوی عبدالباری آسی شارح دیوان غالب کے حوالے سے اس کی متعدد مثالیں نقل کی ہیں۔ اس کا نمونہ یہ ہے:

فارسی: دیگر ساز بے خودی ما صدا مجوی
آوازے از گسستن تار خودیم ما

اردو: نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

مولانا عبدالسلام ندوی کا خیال ہے کہ غالب کے بعض اشعار ایسے ہیں جو انہوں نے اردو میں فارسی سے بعینہ ترجمہ کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں نظیری اور علی حزیں کے بعض اشعار بھی پیش کئے ہیں اور واقعی وہ ان کے محض ترجمے ہیں۔ غالباً وہ اشعار ''آرگس'' کی نظر سے نہیں گذرے، ورنہ وہ غالب پر سرقہ ہی کا الزام عائد کر دیتے لیکن مولانا عبدالسلام ندوی نے غالب پر یہ الزام عائد نہیں کیا ہے۔

مرزا غالب جس عہد کے شاعر ہیں اس عہد کے شعراء کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسے خیال کو جو اپنے اندر بڑی وسعت وتفصیل رکھتا ہے اور کئی شعر میں ادا ہوتا، اسے ایک شعر میں ادا کر دیتے تھے۔ غالب کے کلام میں بھی یہ خوبی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے غالب کی اس خوبی کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ اس کی کئی مثالیں بھی پیش کی ہیں اور اس کے مفہوم کی جس طرح تشریح کی ہے، وہ ان کے تفہیم شعر کی ایک خوب صورت مثال ہے۔ مثلاً مرزا غالب کا یہ شعر ہے کہ:

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مولانا عبدالسلام ندوی نے اس شعر کی وسعت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''۱۔ حالت یہ ہے کہ ایک بلبل چمن اور آشیاں سے جدا ہو کر گرفتار ہوگئی ہے۔

۲۔ اس نے اپنی آنکھوں سے باغ میں بجلی گرتی ہوئی دیکھی ہے اور قفس میں متردد ہے کہ جانے میرا آشیاں بچا یا جل گیا۔

۳۔ ایک اور بلبل جو اس کی ہم صفیر و ہمدم ہے، سامنے کے درخت پر آ کر بیٹھ گئی اور اسیر قفس بلبل نے اس سے اس کی روداد چمن کو دریافت کرنا چاہا ہے۔

۴۔ مگر چونکہ اس کا آشیانہ جل گیا ہے، بلبل ہم صفیر مفصل حال کہتے ہوئے

پس وپیش کرتی ہے کہ آفت اسیری میں آشیانہ جلنے کی خبر کیا سناؤں۔
۵۔بلبل نو گرفتار کے دل میں اگر چہ اس کا کھٹکا ہے تاہم اس نے اپنے دل کو مطمئن کر لیا ہے کہ باغ میں ہزاروں آشیانے ہیں، کیا میرے ہی آشیانہ پر بجلی گری ہوگی؟ اس لئے وہ اپنے ہم صفیر سے روداد چمن پوچھتی ہے اور اس کے بیان کرنے میں لیت ولعل کرتا ہے تو کہتی ہے:

گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اب اس حالت کو پیش نظر رکھ کر اس شعر پر نظر ڈالو، معلوم ہوگا کہ حسن ترتیب کے ساتھ اس کا ایک ایک لفظ اس وسیع مضمون کو ادا کر رہا ہے۔ بلبل کی گرفتاری کی طرف تو صرف ایک قفس کا لفظ اشارہ کر رہا ہے، اس مفہوم کو کہ اس نے خود چمن میں بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے اور اپنے آشیانہ کی نسبت متردد ہے۔ ''کل'' کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ اس خیال کو کہ اس کا ہم صفیر سامنے کی شاخ پر آبیٹھا ہے اور وہ اس سے روداد چمن دریافت کرنا چاہتی ہے لیکن وہ اس کی ہمدردی کے خیال سے اس کے کہنے سے ڈرتا ہے، اس مختصر فقرہ کہ ''مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم'' ظاہر کیا ہے کہ ان تمام باتوں کے ساتھ اس نے اپنے دل کو مضبوط کر کے جس طرح اس سے روداد چمن دریافت کرنا چاہے، اس نے اس مضمون کو کس قدر مؤثر اور دردانگیز کر دیا ہے۔'' (۲)

وسعت خیال پر مبنی اس طرح کے غالب کے کئی اشعار کی مولانا نے تفہیم وتشریح کی ہے، جسے طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہے، البتہ یہ کہنے میں مضائقہ نہیں کہ غالب کی شاعری پر اس طرح کی بحثیں ہمارے قدیم تذکروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اسے مولانا کی انفرادیت تو نہیں قرار دیا جاسکتا البتہ اس میں جدت ضرور ہے اور خاص طور پر اشعار کی تشریح بڑی پر کیف اور نشاط انگیز ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے غالب کے فن شاعری پر خاص طور سے روشنی ڈالی ہے۔

اختصار کے ساتھ یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ غالب کو متحرک تشبیہات پیدا کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

سلطنت دست بدست آئی ہے
جام مے خاتم جمشید نہیں

(۳)

۲۔ اردو شاعری میں مرزا غالب کے جوش بیان کا کوئی ہم سر نہیں:

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

(۴)

۳۔ غالب کا جوش بیان اور بھی بڑھ جاتا ہے جب وہ کسی شخص یا چیز کو حرف ندا کے ساتھ مخاطب کر کے کسی طرف متوجہ کرتے ہیں:

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و ماہ تماشائی

(۵)

۴۔ ممدوح کی مدح میں غیر متوقع گریز یا ابتدا جس سے لطف دوبالا ہوتا ہے، غالب کی شاعری کا ایک وصف ہے:

زباں پہ بارخدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

مذکورہ اوصاف شاعری میں مرزا غالب کو انفرادیت حاصل ہے۔ البتہ فارسی شعراء میں یہ فنی خصوصیات حافظ شیرازی کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی کا خیال ہے کہ اردو میں مرزا غالب نے حافظ کی تقلید کی ہے۔(٦)

البتہ درد وغم، حسرت و یاس وغیرہ مضامین میں غالب نے میر کا تتبع کیا ہے۔ ان

مباحث اوران کی مثالیں نقل کرنے کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ:

''حسن معانی کے ساتھ غالب کا کلام حسن الفاظ ،حسن بندش اور حسن ترکیب کا بھی بہترین نمونہ ہے۔ وہ ایک مضمون آفریں اور معنی بند شاعر ہیں لیکن بایں ہمہ ناسخ کی طرح بھدے، ثقیل اور گراں الفاظ نہیں استعمال کرتے بلکہ ان کی بعض غزلیں فصیح ،سلیس ،رواں اور شستہ الفاظ کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں۔''(۷)

اپنے اس خیال کی صداقت کے لئے مولانا عبدالسلام ندوی نے غالب کے سات اشعار نقل کئے ہیں۔ یہاں ایک پر اکتفا کیا جاتا ہے:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

اس کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی نے حسن بندش، بندش کی چستی و روانی کی ان کے اشعار سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ لیکن مولانا مرزا غالب کی صنائع و بدائع میں کم مائیگی کے قائل تھے اور لکھا ہے کہ:

''غالب کے کلام میں اگرچہ صنائع و بدائع بہت کم پائے جاتے ہیں تاہم رعایت لفظی سے جس کو اس دور میں شعرائے لکھنؤ نے بہت زیادہ نمایاں اور عام کر دیا تھا بالکل محفوظ نہ رہ سکے اور بعض جگہ تو اس صنعت کو کسی قدر بھدے طریقے سے برتا ہے۔''(۸)

مولانا عبدالسلام ندوی نے مرزا غالب کے مرصع و مسجع اشعار، قافیہ، حسن قافیہ اوران کی بعض بحروں کی بھی تحسین کی ہے اور بطور نمونہ اشعار نقل کئے ہیں۔ اس سلسلے کے اشعار یہ ہیں:

لالہ و گل کا جوش ہے بلبلوں کا خروش ہے
فصل وداع ہوش ہے موسم ناؤ نوش ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری

اور پھر وہ بھی زبانی میری

مولانا نے مرزا غالب کے فن شاعری پر اظہار خیال تو کیا ہے لیکن فکر و فلسفہ شاعری کا کہیں ذکر نہیں لیکن اس بحث سے یہ پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ وہ مرزا غالب کے سخن فہم اور طرفدار دونوں تھے۔ البتہ یہ معاملہ غزلیہ شاعری تک محدود ہے۔ قصائد، مراثی، سہرے اور دیگر اصناف سخن پر مولانا نے شعر الہند جلد دوم میں جو ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ اس میں غالب کے اعتراف کمالات کے ساتھ بعض تنقیدیں بھی شامل ہیں۔

مرزا غالب قصیدہ نگار کی حیثیت سے وہ مقام نہیں رکھتے جو سودا وغیرہ کو حاصل ہے مگر مولانا عبدالسلام ندوی نے مرزا غالب کے قصیدوں کی تعریف و تحسین کی ہے۔ غالب کے اس قصیدہ کو جس کا مطلع ہے:

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اردو شاعری کا سرمایہ ناز قرار دیا ہے۔(۹) مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ یہ قصیدہ اگر چہ ایشیائی رسمی قصیدہ گوئی سے یکسر مختلف ہے مگر اس کی سلاست، روانی، متانت، جزالت اور تشبیب نے اردو قصیدہ گوئی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔(۱۰) وہ لکھتے ہیں:

''اس قصیدہ کے علاوہ ان کے اور قصائد بھی اردو زبان میں قصیدہ گوئی کا ایک نیا باب کھولتے ہیں۔ ذوق وغیرہ قصائد میں بڑے مغلق الفاظ اور علمی اصطلاحات سے شان وشکوہ پیدا کرتے ہیں حالانکہ الفاظ کی متانت و جزالت، اغلاق و ابہام سے بالکل مختلف چیز ہے لیکن غالب کے قصائد میں جو شاندار ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں ان میں صرف متانت و جزالت پائی جاتی ہے۔ ثقل، اغلاق، ابہام نہیں پایا جاتا، اسی کے ساتھ جوش اور زور بیان نے ان قصائد کو ایک نعرہ جنگ بنا دیا ہے، مثلاً:

صبح دم دروازہ خاور کھلا
مہر عالم تاب کا منظر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو راز مہ واختر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

یہ پورا قصیدہ تشبیب سے مدح ودعا تک جوش وبیان کا بہترین نمونہ ہے۔"(۱۱)

انہوں نے بعض دیگر قصائد غالب کی بھی تحسین کی ہے۔ان کا خیال تھا کہ سودا نہایت ذلت آمیز انداز اختیار کرتے ہیں حتیٰ کی ان سے شرم محسوس ہونے لگتی ہے، جبکہ غالب نری مداحی میں بھی متانت وسنجیدگی قائم رکھتے ہیں۔قصیدہ گوئی میں ان کے کمالات کا اعتراف غالباً اس لئے کیا گیا ہے کہ ان کے قصیدے روایتی قصیدہ نگاری کی عام روش سے جدا ہیں۔البتہ ایک اور قصیدہ جس کا مطلع ہے:

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار
سایہ لالہ بے داغ سویدائے بہار

اس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ غالب نے جہاں بہار کا سماں دکھلایا ہے، نہایت نادر تشبیہیں پیدا کی ہیں۔مبالغہ کو حد کمال تک پہونچا دیا ہے اور نہایت لطیف استعاروں سے کام لیا ہے لیکن قوت تخیئل کے بے جا استعمال کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک پھول بلکہ ایک پنکھڑی کی اصل تصویر بھی پیش نہ کر سکے۔(۱۲)

مولانا عبدالسلام ندوی کا خیال ہے کہ غالب ذاتی زندگی میں فراخی کے باوجود قانع کبھی نہیں رہے بلکہ قناعت کی لہر تک ان میں پیدا نہیں ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بعض قصائد بالکل فقیروں کی صدا ہو گئے۔(۱۳) مولانا نے اپنے موقف کی تائید میں ان کے ایک قصیدہ کے کئی اشعار نقل کئے ہیں:

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الاظہار

کچھ خرید نہیں ہے اب کی سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل ونہار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینہ قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہوگیا ہے شریک ساہو کار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

البتہ مولانا جب مرزا صاحب کی غزلیہ شاعری سے ان کے قصائد کا موازنہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''غزل میں وہ اخلاقی حیثیت سے جس قدر بلند تھے اسی قدر قصیدے میں پست ہوگئے۔'' (۱۴)

مولانا عبدالسلام ندوی نے شعرالہند میں اخلاقی شاعری کے ضمن میں مرزا غالب سے

زیادہ تعارض نہیں کیا ہے۔اس سے اگر چہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اخلاقیات کے باب میں مولانا کے نزدیک غالب کا غالبًا گذر نہیں لیکن یہ محض قیاس بھی ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ چند شعر استعفاف، استقلال، علوئے ہمت اور عفو و در گذر کے نام سے نقل ہوئے ہیں۔ جو یہ ہیں:

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

آئی اگر بلا تو جگہ سے ٹلے نہیں
ابراہی دے کے بچایا ہے ہم کشت کو

دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

ہنگامہ زبونی ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

عبدالسلام ندوی نے شعرالہند حصہ دوم میں ایک باب میں اردو کی فلسفیانہ شاعری کا تجزیہ کیا ہے۔اس میں میر، سودا، ناسخ، مصحفی، میر حسن، قائم، صبا، اکبر اور حالی وغیرہ کے فلسفیانہ اشعار نقل کر کے فلسفہ شاعری پر بحث کی ہے۔عبدالسلام ندوی کے استاذ شبلی نے تو غالب کے فلسفہ

شاعری کا بطور خاص ذکر کیا ہے، مگر انہوں نے اس باب میں غالب کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

مولانا عبدالسلام ندوی نے مراثی کی جو تنقیدی تاریخ لکھی ہے اس میں مرزا غالب کے دو مرثیوں کی بڑی تحسین کی ہے۔ ایک وہ مرثیہ ہے جو انہوں نے جواں سال عارف کی موت پر لکھا تھا:

کیا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

دوسرا مرثیہ غالب نے اپنی کسی معشوقہ کی وفات پر کہا تھا، جس کا مطلع یہ ہے:

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تیری غفلت شعاری ہائے ہائے

مولانا عبدالسلام ندوی نے عارف کے مرثیے کے طرز تخاطب کو نہایت مؤثر بتایا ہے جبکہ دوسرے معشوقہ والے مرثیے کی متانت، سنجیدگی اور عالی جذبات کی تحسین کی ہے۔

شعرالہند میں مرزا غالب کے حوالے سے آخری بحث ذوق و غالب کے سہرے کی ہے۔ ذوق کے سہرے کو علی العموم غالب سے بہتر قرار دیا جاتا رہا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی بھی اسی کے قائل ہیں مگر اس باب میں ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے مرزا غالب کے بعض اشعار کی ستائش کی ہے۔ البتہ یہاں یہ لکھنا شاید نامناسب نہ ہو کہ شبلی کے ایک اور شاگرد اقبال احمد خاں سہیل ذوق کے سہرے کے بڑے نکتہ چیں ہیں۔ انہوں نے ذوق کے سہرے کو سرقہ کی بدترین مثال قرار دیا ہے اور غالب کے سہرے کو ذوق کے بالمقابل بدرجہا بہتر قرار دیا ہے۔ حالانکہ ان سے پہلے تمام بڑے نقادوں نے ذوق ہی کے سہرے کو قابل اعتناء تصور کیا تھا۔ اس کی تفصیل سے گریز کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی اور اقبال سہیل کی تنقیدیں درج کی جاتی ہیں۔ غالب کے سہرے کا شعر ہے:

سات دریا کے فراہم کیئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

ذوق فرماتے ہیں:

اک گہر بھی نہیں صد کان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

مولانا عبدالسلام ندوی کا خیال ہے کہ غالب کا مذکورہ شعر ذوق کے شعر سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ غالب کے شعر میں بندش کی چستی ہے جبکہ ذوق کے ہاں یہ بات نہیں۔اس شعر کا تجزیہ کرتے ہوئے اقبال سہیل لکھتے ہیں:

''غالب کے شعر میں الفاظ زیر خط قابل توجہ ہیں۔موتی عموماً مختلف الاشکال ،مختلف اللون اور مختلف القامت ہوتے ہیں ،اس لئے ایک قد اور ایک خاص انداز کے بڑے بڑے شفاف ، ہموار، سڈول اور قیمتی موتیوں کا چھانٹنا اور وہ بھی گز بھر لمبے سہرے کے لئے بہت دشوار ہے ۔ غالب کا خیال ہے کہ غالباً ساری دنیا کے موتی فراہم کئے گئے ہوں گے تب کہیں جا کر اتنے موتیوں کا انتخاب ہو سکا ہوگا ۔ انتہائی مبالغہ کے باوجود غالب کا شعر عین فطرت کے مطابق ہے،جس کی صداقت کا امکان ہے۔علاوہ بریں غالب ''بنا ہوگا'' کہتا ہے جو محض ظن وتخمین ہے،ذوق کی طرح ''بنوایا ہے'' کہہ کر بیان واقعہ نہیں کرتا۔لہٰذا غالب کے شعر میں کوئی امر عقلاً مستبعد نہیں ہے ۔اب حضرت ذوق کا جوابی شعر دیکھئے اولاً کوئی مصرع تعقید سے خالی نہیں ہے اور مصرع ثانی میں اجتماع تعقیدین نے شعر کو غارت کر دیا۔ثانیاً باعتبار مفہوم اس شعر کی نثر یہ ہوگی ۔

جواہرات لیتے گئے ہیں اور تیرا سہرا بناتے گئے ہیں ۔ایک گوہر بھی نہیں چھوڑا،اس طرح جواہرات کی سوکانیں بالکل خالی کر دی ہیں ۔

شعر سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کتنا بڑا سہرا ہے ۔مزید براں جواہرات میں کسی خاص انداز یا خاص حیثیت کی تخصیص نہیں ہے بلکہ بقول ذوق ایک بھی چھوٹا نہیں ہے ۔سب کے سب خواہ کسی رنگ،کسی قد،کسی وزن،کسی

شکل اور کسی حیثیت کے ہوں بلا امتیاز سہرے میں گوندھ دئے گئے ہیں۔ سبحان اللہ یہ سہرا کاہے کو ہوگا، بجائے خود ایک پہاڑ ہوگا۔ تعجب ہے کہ نوشہ نے اس کو سنبھالا کیونکر، اس سے زیادہ بے معنی اور مکروہ مثال کیا ہوسکتی ہے کہ ذوق نے غالب کا شعر سامنے رکھ کر سرقہ کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

غالب نے سات دریا کہے تھے جناب ذوق نے ''صد کان گہر'' کہا، سات کا جواب سو دیا، پھر بھی کمی رہ گئی۔ سات دریا یعنی ساتوں سمندروں کے بعد پھر کوئی سمندر دنیا میں باقی نہیں بچتا لیکن صد کان گہر کہنے کے بعد بھی ہزاروں معادن باقی رہتے ہیں۔(۱۵)

غالب کے سہرے کا ایک شعر ہے:

یہ بھی ایک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

مولانا کا خیال ہے کہ یہ ایک بے مثال شعر ہے۔ ذوق سے اس کا جواب نہ بن پڑا۔

ذوق کا شعر ہے:

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے منہ کو جو منہ سے اٹھا کر سہرا

وہ کہے صل علی یہ کہے سبحان اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

غالب فرماتے ہیں:

رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا

مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ غالب کا یہ شعر گوہر شاہوار کی طرح چمک رہا ہے۔ ذوق کے اشعار بھی عمدہ ہیں مگر ایک شعر کا دو شعر میں جواب دینا شاعرانہ کمزوری ہے۔

شعر الہند کی ایک اہم بحث بلکہ مولانا عبدالسلام ندوی کی اختراع دلی ولکھنو اسکول کی نشاندہی اور ان کی خصوصیات شاعری کا بیان ہے۔انہوں نے متعدد شعراء کی شاعری پر نقد و بحث میں اس حیثیت سے بھی بحث وگفتگو کی ہے کہ آیا مذکورہ ادبی اسکولوں کے کیا اثرات مرتب ہوئے، چنانچہ مرزا غالب کے کلام پر بھی اس نوعیت سے نظر ڈالی ہے اور اسے اس سلسلے کا نقطہ آغاز قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''باوجود تمام ایجادات واختراعات کے مرزا کا کلام لکھنو کے اثر سے نہ بچ سکا، چنانچہ ان کے دیوان میں بعض نہایت مبتذل اشعار ملتے ہیں۔مثلاً:

خوشی کے مارے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے ہاتھ پاؤں داب دے

فینس میں گذرے ہیں جو کوچہ سے ہمارے
کاندھا بھی کہاروں سے بدلنے نہیں دیتے

یہ پہلا دن تھا کہ دلی کا شاعرانہ رنگ لکھنو سے بالکل الگ ہو گیا۔''(۱۶)

عبدالسلام ندوی کے مذکورہ خیالات اور تحریروں سے بحیثیت مجموعی یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ مرزا غالب کے بڑے پرستار اور عقیدت مند تھے اور یہ عقیدت مندی غالب کی شاعرانہ عظمتوں کی وجہ سے ان کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔

حواشی

(۱) شعر الہند اول ص ۲۱۹-۲۲۰

(۲) شعر الہند اول ص ۲۲۳-۲۲۴

(۳) شعر الہند اول ص ۲۲۸

(۴) شعر الہند اول ص ۲۲۸

(۵) شعر الہند اول ص ۲۲۹

(۶) شعر الہند اول ۲۲۸-۲۳۰

(۷) شعرالہند اول ص۲۳۱
(۸) شعرالہند اول ص۲۳۵
(۹) شعرالہند دوم ص۱۲۲
(۱۰) شعرالہند دوم ص۱۲۴
(۱۱) مقالات عبدالسلام ص۳۴۵
(۱۲) شعرالہند دوم ص۳۹۲-۳۹۱
(۱۳) مقالات عبدالسلام ص۳۴۷
(۱۴) مقالات عبدالسلام ص۳۴۳
(۱۵) افکار سہیل ص۱۷۴-۱۷۵
(۱۶) مقالات عبدالسلام ص۳۴۰-۳۴۱

ایک مداح

مولانا سعید انصاری

اوران کے چند خطوط

مولانا عبدالسلام ندوی علم وفضل کے اس بلند مقام پر فائز تھے جہاں حد امتیاز من وتو مٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عزت وشہرت، صلہ وستائش اور ناموری کو انہوں نے قابل اعتنا نہ سمجھا۔ دراصل وہ فنافی العلم تھے۔ ان کی یہی خوبی انہیں معاصرین سے ممیّز وممتاز کرتی ہے۔ ان کے مداحوں نے جس میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا سعید انصاری جیسے اہل علم وکمال کا نام شامل ہے۔ ان کے فضل وکمال اور عظمت وبلند پایگی کا اظہار واعتراف خاص طور سے کیا ہے۔

ان کے ممدوحین میں مولانا سعید انصاری کا نام سب سے نمایاں ہے۔ وہ خود بڑے پایہ کے عالم وفاضل شخص تھے۔ تصنیف وتالیف میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں دادسخن دی جن کے علاحدہ علاحدہ مجموعے شایع ہوئے۔ عربی زبان وادب پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ عربی دانی میں مہارت ہی کی وجہ سے پروفیسر مارگولیتھ نے انہیں جمعیۃ آداب اللغۃ العربیہ لندن کا رکن نامزد کیا تھا۔(۱)

دارالمصنّفین کے بالکل ابتدائی دور فروری ۱۹۱۶ء میں وہ اس ادارے سے وابستہ ہوئے۔ تلامذہ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی کے بعد وہ پہلے شخص تھے جو دارالمصنّفین میں رفیق مقرر ہوئے اور اپنی علمی صلاحیتوں سے اس ادارے کو

پروان چڑھانے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔

دارالمصنّفین اعظم گڑھ کا آغاز سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیر الصحابہؓ کی تدوین سے ہوا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اسوۂ صحابہؓ وصحابیاتؓ جیسی بے مثال تصنیف سے اس سلسلہ کی داغ بیل ڈالی۔ ان کے اخلاص کا نتیجہ تھا کہ یہ سلسلہ ۱۴ جلدوں میں پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ اس منصوبے کی تین کتابیں سیر انصار دو جلدیں اور سیر الصحابیات مولانا سعید انصاری کے قلم سے نکلیں اور آج تک مقبول ہیں۔

سعید انصاری صاحب ایک وقفہ کے ساتھ ۱۹۳۰ء تک دارالمصنّفین میں رہے لیکن مولانا عبدالسلام ندوی سے ان کی عقیدت کبھی کم نہ ہوئی بلکہ وقت کے ساتھ اور بڑھتی گئی۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک طویل قصیدہ لکھا جو ان کے مجموعہ غزلیات فارسی میں شامل ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہماں عبد السلام من، قوام من، امام من — بدم دارد دم عیسیٰ، بکف دارد ید بیضا
فلاطون فن، مسیحا دم، ارسطو مغز، حافظ نغز — بحکمت ہست چوں یعقوب کندی پایہ‌اش بالا
بمنطق قطب شیرازی، حریف طوسی و رازی — بدانش نصر فارابی، بہ بینش بو علی سینا
بہ سلطانی اردو ہم و دانش مند اعظم ہست — ہماں استاذ کامل، شبلی نعمانی دانا
ہمہ داں و ہمہ گیر و ہمہ فضل و ہمہ دانش — کہ افروزد چراغ عقل خود از علم الاسماء(۱)

یہ قصیدہ عقیدت ومحبت اور اعتراف کمالات سے پر ہے۔ صاحب شعر الہند کے متعدد ادباء وشعراء سے روابط تھے لیکن شاید ہی کسی اور نے اس قدر پر زور خراج عقیدت پیش کیا ہو۔ جب کہ مولانا سعید انصاری نے نہ صرف نظم میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے بلکہ اپنے ایک مضمون میں جو شبلی کالج میگزین کے عبدالسلام نمبر میں شایع ہوا ہے، ان کی عظمت اور تبحر علمی کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ایک ہمہ داں عالم، فلسفی مزاج مصنف، قادر الکلام انشا پرداز کی حیثیت سے مولانا کے رشحات قلم نے علم وفن کے ہر شعبہ کو سیراب کیا۔ الٰہیات، عقلیات، عمرانیات، نفسیات، تفسیر، شان نزول، حدیث، فقہ، اصول علم

> اسرار الدین، فلسفہ، منطق، کلام، تاریخ، سیرت، اسماء الرجال، فلسفہ تاریخ، فلسفہ مذہب، سائنس، معانی، بیان، بدیع، عروض، تنقید، خطابت، شاعری، غرض علوم قدیمہ وجدیدہ کی تینوں شاخوں یعنی فنون حکمیہ، دینیہ اور ادبیہ میں سے بہ استثنائے ریاضی وطب کون سی شاخ ہے جس میں ان کا قلم رواں نہیں ہے۔؟ اپنے جامع الکمالات استاذ کی طرح وہ بھی اکثر علوم کے چمن آرا ہیں۔ اگر اسوۂ صحابہؓ اور سیرت عمر بن عبدالعزیز اسلامی کتاب خانوں کی زینت بن سکتی ہیں تو انقلاب الامم کو بین الاقوامی ادب کی الماریوں میں بے تکلف سجایا جا سکتا ہے۔ یہاں پہونچ کر مولانا اردو کے اکثر مصنّفین سے علاحدہ ہو جاتے ہیں اور وہ ارسطو، کندی، فارابی، اور ابن سینا کی صف میں نظر آتے ہیں۔(۳)

اسی معرکہ آراء مضمون میں انہوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کے اولیات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ جو یہ ہیں:

۱۔ مولانا اس زمانہ کے مشاہیر میں پہلے شخص ہیں جس نے اپنے دائرہ سے باہر قدم نہیں نکالا۔ وہ تمام عمر صرف علم وادب کی خدمت میں مصروف رہے۔

۲۔ وہ پہلے مصنف ہیں جس نے تصنیف کا کام باقاعدہ سیکھا۔ تمام ہندوستان میں ان کے علاوہ ایک شخص بھی نہیں ہے جو یہ کام باقاعدہ جانتا ہو۔

۳۔ ان ہی نے طلبائے ندوہ میں سب سے پہلے مضمون نویسی پر انعام پایا۔

۴۔ سب سے پہلے علامہ شبلی کا طرز تحریر اختیار کیا اور سب سے زیادہ کامیاب رہے۔

۵۔ سب سے پہلے علامہ مرحوم کے رسم خط کی تقلید کی اور سب سے زیادہ ان سے مشابہ خط لکھا۔

۶۔ ان ہی نے سیر الصحابہؓ کی داغ بیل ڈالی۔

۷۔ ان ہی نے صحابہ کرامؓ کے کارناموں پر تبصرہ کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔

۸۔ شعر الہند میں تنقید وترتیب کا نیا انداز نکالا جو شعر العجم سے بالکل الگ ہے۔

۹۔ وہ فطرتاً ادیب وشاعر پیدا ہوئے۔(۴)

مولانا عبدالسلام ندوی نے جب وفات پائی اس وقت مولانا سعید انصاری لاہور میں دائرہ معارف اسلامیہ کے شعبہ اردو سے وابستہ تھے۔ یہاں انہوں نے علامہ شبلی کی یاد میں ایک ادارہ شبلی مرکز قائم کیا تھا جو پہلے ٹمپل روڈ پر تھا پھر کہیں اور منتقل ہوگیا۔ اس کے تحت انہوں نے ایک مکتبہ بھی قائم کیا تھا جس میں دارالمصنّفین اعظم گڑھ انجمن ترقی اردو کراچی اور جامعہ ملیہ دہلی وغیرہ کی مطبوعات دستیاب رہتی تھیں۔ شبلی مرکز لاہور سے انہوں نے ایک سہ ماہی رسالہ ''شبلی'' کے نام جاری کیا تھا جس کا ذکر شبلی مرکز کے لیٹر ہیڈ پر بطور اشتہار موجود ہے۔ یہ اشتہار اس طرح ہے۔

شبلی

''شبلی مرکز لاہور کا علمی وادبی سہ ماہی رسالہ، جو اپریل، جون۔ جولائی، ستمبر، اکتوبر، دسمبر۔ جنوری، مارچ۔ میں پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔''

یہ اشتہار محض اشتہار ہی رہا یا رسالہ شائع ہوا اس کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ یقین ہے کہ اگر یہ شائع ہوا ہوتا تو اس کی کاپیاں دارالمصنّفین میں ضرور محفوظ ہوتیں۔ اب اس کے بارے میں لاہور کے اہل قلم ہی قطعی طور پر کوئی بات کہہ سکتے ہیں کہ آیا یہ رسالہ شائع ہوا یا نہیں۔ اسی طرح یہ سوال کہ شبلی مرکز کب قائم ہوا اور اس نے کیا خدمات انجام دیں اور اس سے کون کون سی کتابیں شائع ہوئیں، تحقیق طلب ہے۔ راقم کو اس مرکز سے کم از کم مولانا سعید انصاری کے فارسی کلام ''غزلیات فارسی'' کی اشاعت کا علم ہے، جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔

مولانا سعید انصاری مولانا عبدالسلام ندوی کا قصیدہ اور مضمون لکھنے کے بعد ان کی مکمل سوانح عمری ''حیات عبدالسلام'' کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا خاصہ حصہ لکھ ڈالا جیسا کہ ان کے ایک خط سے جو مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کے نام ہے پتہ چلتا ہے۔ مولانا اصلاحی مولانا عبدالسلام ندوی کے بھتیجے اور مدرستہ الاصلاح کے ممتاز فرزند ہیں اور اپنے چچا ہی کی طرح اخلاص اورشرافت ومروت کے پیکر ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی کے بعض نجی اور خاندانی احوال کے لئے مولانا سعید انصاری نے انہیں خطوط لکھے جواب اصلاحی صاحب کی عنایت ے میرے پاس محفوظ

ہیں۔ یہ کل پانچ خط ہیں جو۲؍مارچ ۱۹۵۹ء سے یکم جولائی ۱۹۵۹ء کے دوران لکھے گئے ہیں۔ طوالت کے باوجود یہ خطوط یہاں نقل کئے جاتے ہیں تاکہ یہ محفوظ ہوجائیں اور آیندہ ''حیات عبدالسلام'' لکھنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں اور ان سے یہ اندازہ کیا جاسکے کہ مولانا عبدالسلام ندوی پر اب تک جو کام ہوا ہے اس میں وہ کون سے پہلو ہیں جن کی طرف توجہ نہ کی جاسکی یا جناب ہارون اعظمی صاحب جو مولانا کے فکر و خیال اور ان کے علمی کارناموں کے فروغ و اشاعت کے لئے مسلسل تن دہی کے ساتھ کوشاں ہیں وہ ان کی طرف توجہ دیں اور مکمل ''حیات عبدالسلام ندوی'' شایع ہوسکے۔

(۱)

شبلی مرکز لاہور
۲؍مارچ ۱۹۵۹ء

مکرمی! السلام علیکم

مجھے مولوی انیس احمد صاحب سے آپ کا نام معلوم ہوا۔ مولوی عبدالسلام صاحب سے جو آپ کا رشتہ ہے اس کے لحاظ سے اگر کچھ تکلیف دی جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مجھے مولانا کے دادھیال اور نانہال کے نسب ناموں کی ضرورت ہے۔ براہ راست سلسلوں کے علاوہ دادی، پردادی، نانی، پرنانی، وغیرہ کے نام اور نسب نامے بھی اگر بھیجیں تو مزید عنایت ہوگی۔

مولانا کی سوانح عمری میں اور بھی بہت سی باتیں دریافت کرنے کی ہیں جو وقتاً فوقتاً پوچھتا رہوں گا۔ سوانح کا خاصہ حصہ ہوگیا ہے۔ آپ بھی ان کے ذاتی حالات کی نسبت اگر کچھ بھیجتے ہیں تو کیا اچھا ہو، جو باتیں لینے کے قابل ہوں گی کتاب میں آپ کے حوالہ سے شامل کرلی جائیں گی۔

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ رشید صاحب سے سلام کہئے گا اگر وہاں

رہتے ہوں۔ والسلام

سعید انصاری

---

(۲)

شبلی مرکز لاہور

۳۰/مارچ ۱۹۵۹ء برادرم

کل کی ڈاک سے لفافہ ملا، نہایت خوشی ہوئی ۔ ایک مشکل یعنی دادھیالی نسب کی حل ہوئی لیکن یہ نہ معلوم ہوسکا کہ علاء الدین جن کے نام سے گاؤں آباد ہوا مولانا کے مورثوں میں تھے یا نہیں؟ محمد صدیق صاحب زیادہ سے زیادہ اکبر کے زمانہ میں ہوں گے۔ کیا علاء الدین اگر وہ مورث تھے۔ ان سے بھی اوپر تھے؟ اور تھے تو کتنی پشت اوپر؟ یہ گاؤں کب آباد ہوا؟ اگر وہاں کا پہلا ''واجب العرض'' جو غدر سے پہلے داخل کیا گیا تھا مل جائے تو یہ بات صاف ہو جائے، کیونکہ اس میں سب ہوگا۔ اخلاق احمد اپنے کو قریشی لکھتے ہیں! مولانا سے میں نے کچھ نہیں سنا، کیونکہ کبھی پوچھا نہیں، اس پر بھی روشنی ڈالئے گا۔ مولانا کا نانہال جیراج پور ہے اس لئے مولوی محبوب الرحمٰن اور مولانا اسلم کو ملا کر سب شاخوں کا نسب نامہ بھیجئے اور یہ بھی کہ یہ لوگ کس خاندان کے ہیں؟

مولانا کی نانی اور دادی کا نام آپ نے لکھا لیکن ان کے آگے کا نسب کم از کم باپ کا نام اور خاندان اور گاؤں آپ نے نہیں لکھا، اس کی بھی تصریح فرمایئے، یہ چیزیں اگر اس وقت چھوڑ دی گئیں تو آیندہ کوئی بتانے والا نہ ملے گا، جیراج پور میں میرا اب کوئی شناسا نہیں، ورنہ آپ کو تکلیف نہ دیتا۔ مولانا کی پیدایش کی تاریخ، دن، چاند کا مہینہ یا انگریزی تاریخ، ان کی عمر جب وہ کان پور گئے، مولوی محبوب الرحمٰن کے بی۔ اے کرنے کا سال

(اگر برابر پاس ہوتے گئے ہوں۔) مولانا کی عمر شادی کے وقت، شادی کا سنہ، اخلاق کی پیدائش کا سنہ وغیرہ بھی تحریر فرمائیں۔ والسلام

سعید انصاری

---

(۳)

شبلی مرکز لاہور

۱۱رمئی ۱۹۵۹ء

برادرعزیز۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

کارڈ ملا، علالت کی خبر پڑھ کر تشویش پیدا ہوئی، کیا بیماری ہے؟ امید ہے کہ اب اچھے ہوں گے۔

۱۔مولوی شبلی صاحب متکلم سے تو ملاقات ہوتی ہوگی، وہ مولوی صاحب کے ساتھی ہیں۔آپ ان سے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۰ء تک تمام اساتذہ اوران سے متعلق کتابوں کے نام دریافت کریں تا کہ پتہ چلے کہ مولانا نے کن کن استاذوں سے کیا کیا کتابیں پڑھیں؟ اور ندوہ میں کن کتابوں سے ابتدا کی؟

۲۔عبدالحکیم صاحب سے بندول میں یہ پوچھئے گا کہ علامہ مرحوم کے انتقال کے وقت مولوی حمید صاحب اور سید صاحب تو تھے مولوی مسعود تھے یا نہیں؟ مولوی عبدالسلام صاحب کب آئے ؟

۳۔جیراج پور میں اگر کوئی بتانے والا یا والی یہ بتا سکے کہ مولانا کی پیدائش کی تاریخ اور مہینہ چاند کے حساب سے یا انگریزی کیا تھا۔؟

باقی باتیں لکھ چکا ہوں۔''عبدالسلام نمبر'' نہیں کتابچہ شایع ہو۔اس میں سب سے بہتر مضمون میرا تھا، اس کی جو گت بنی آپ کو معلوم ہوگی۔ باقی مضامین میں دو نااہلوں کے اور دو نجس خبیثوں کے ہیں، اس سے اچھا

تھا کہ یہ رسالہ نہ نکلتا۔ وہ نہایت پاک انسان تھے ناپاک مضامین ان کے حسب حال نہیں ۔امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔مولوی انیس صاحب سے کل ملاقات ہوئی تھی،آپ کا تذکرہ بھی آیا۔

ہاں مقصود کے پاس مولانا کی چھڑی اور ٹوپی ہے۔ میں نے مانگی تھی انہوں نے کہا تھا بھیج دوں گا لیکن وہ لا پتہ ہیں۔ بندول میں ملیں تو لے لیجئے گا۔مولانا کے کپڑے وغیرہ جاہلوں نے فقیروں کو دے دیئے ، مجھے ملتے تو یہاں میوزیم میں رکھا دیتا۔مہینوں سر مارا نتیجہ نہ نکلا ۔ یہ سب جہالت کا کرشمہ ہے۔بڑے آدمی کو پہچانتے نہیں۔ والسلام

سعید انصاری

---

(۴)

شبلی مرکز لاہور

۷؍جون ۱۹۵۹ء

مکرمی سلام علیک

کل کارڈ ملا،خیریت معلوم ہوکر اطمینان ہوا۔کیا اخلاق کا تبادلہ پونہ میں ہوگیا ہے؟ان کا پتہ لکھئے گا،اگر وہ آخر جون تک رہیں اور عید میں آپ گھر جائیں تو ان سے مولانا کی غزلیں لے کر مجھے بھیج دیجئے،اب شاعری پر تبصرہ کرنا ہے۔بقیہ دریافت طلب امور بھی جلد لکھ کر بھیجئے اور مقصود سے چھڑی اور ٹوپی وصول کیجئے۔

شمیم آپ کے چچا زاد بھائی کیا کرتے ہیں؟ اور ان کا پتہ کیا ہے؟ مولانا شبلی متکلم کا پتہ کیا ہے؟ ان سب سے اب خط و کتابت کرنا ضروری ہے۔اکیلے اخلاق کافی نہیں وہ صدیوں جواب میں ٹال جاتے ہیں۔

اخلاق کے بچوں کو دعا کہیے گا اور ابوالاحرار وغیرہ کو بھی یہ بتایئے کہ

مولانا کے ایک چچا بہت سیاہ فام تھے انہوں نے ''العجاج الثجاج'' (طویل نام ہے) ایک کتاب لکھی تھی ان کا نام کیا تھا؟ میں نے ان کو دیکھا ہے لیکن نام نہیں جانتا۔

سید امداد علی مولانا کے ابتدائی استاد، کیا قاضی عبدالرحمٰن حیرت مدرس جارج اسکول اعظم گڑھ کے چچا تھے؟ اگر نہ تھے تو حیرت صاحب کے چچا کا کیا نام تھا جنہوں نے مولانا کو پڑھایا تھا؟

''عبدالسلام نمبر'' بہت مایوس کن رہا۔ میرا مضمون جو سب سے اچھا تھا سازش کی نذر ہو گیا۔ میری فارسی غزلیات مدرسہ میں ہوں گی، ان کو دیکھئے، مولانا کی شان میں ایک قصیدہ ہے، اس کو پڑھا کیجئے۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ سعید انصاری

شعبہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

---

(۵)

شبلی مرکز لاہور

ا ر جولائی ۱۹۵۹ء

برادرم! السلام علیکم

ا۔ تبرکات کا شکریہ قبول فرمائے۔ یہ نعمت غیر مترقبہ آپ کی بدولت مجھے ملی۔ مولانا کے انتقال کے زمانہ میں اگر میں وہاں ہوتا تو چار پائی، بستر، کپڑے کوئی چیز بھی اعزہ کو نہ دیتا، وہ سب چیزیں کہیں محفوظ کر دی جاتیں مگر خیر، جو کچھ ہوا ہوا۔

۲۔ کبیر احمد جائسی کے پاس ان کا ایک مضمون ''حدیث، استہزاء منکرین حدیث اور انکار حدیث مہدی آخر الزماں پر ہے۔ اس کو کسی ترکیب سے

منگوا کر میرے پاس بھیج دیجئے۔ جائسی اس رسالے پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں مگر وہ کیا لکھیں گے۔ 'عبدالسلام نمبر' میں سب کی قابلیت دیکھ لی۔

۳۔مولانا کا دادھیال اور نانہال کیا راجپوت ہے؟ اگر یہ بات ہے تو شیخ کیوں لکھتے ہیں؟ رحیمن، مولانا کی دادی کہاں کی رہنے والی تھیں؟ حیات اللہ نام تھا یا حیات علی ؟ نصیرالدین یا ناصرالدین؟

۴۔کیا آپ کے مدرسہ میں الندوہ (۱۹۰۶۔۱۹۱۴ء) کا فائل ہے ؟ یہاں کے لوگ حدیث العہد با لاسلام ہیں، اس لئے الندوہ وغیرہ نہیں جانتے! مجھے مولانا کے مضامین کی فہرست چاہیے، الندوہ اگر ہو تو مطلع کریں تا کہ فہرست بنانے کا طریقہ لکھ بھیجوں۔معارف سے بنالی ہے اور الہلال سے بھی، اب الندوہ اور البلاغ سے بنانا ہے۔

۵۔مولوی شبلی سے مولانا کے اساتذہ کے نام چاہیے، کس استاذ سے کس سنہ میں کون سی کتاب پڑھی؟ یہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۰ء تک چاہیے اور کیا کیا علوم ندوہ میں پڑھے؟ آگرہ اور غازی پور میں کہاں تک پڑھا تھا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فاروق صاحب سے کچھ نہیں پڑھا،۔مولانا طیب عرب سے ادب پڑھا، کیا یہ صحیح ہے۔

۶۔دستار بندی ۱۹۱۰ء میں کہاں ہوئی؟ امتحاناً جو عربی کا مضمون جلسہ میں بیٹھ کر لکھا تھا کیا کہیں دارالعلوم ندوہ کے فائلوں میں ہوگا؟

۷۔غالباً ۱۹۱۰ء میں شبلی جارج اسکول کے جلسہ تقسیم اسناد میں بورود نواب عبدالمجید و نواب محمد یوسف جو ترکیب بند فارسی میں پڑھا تھا اس کی نقل نواب یوسف کی کوٹھی سے مل سکے گی؟ (غالباً گورکھپور کے باشندے ہیں!) یا اسکول کے فائلوں میں ہوگی؟

۸۔شیخ دین محمد صاحب اور ان کی والدہ کی وفات کب ہوئی ؟

۹۔اخلاق کے پرنسپل ہونے کی خبر سے خوشی ہوئی۔ظالم نے سارا خط

خود لکھا مگر سلام ندارد۔ عجب بدحواس آدمی ہے۔ والسلام

سعید انصاری

ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا سعید انصاری ''حیات عبدالسلام'' کا زیادہ حصہ قلم بند کر چکے تھے اور مولانا مرحوم کے خانوادے کے ایک ایک فرد سے رابطہ قائم کر کے اسے مزید جامع بنانا چاہتے تھے تا کہ حیات عبدالسلام ہر طرح سے مکمل طور پر شایع ہو۔ دوسری بات جو واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ اس وقت تک مولانا مرحوم پر جو کام ہوا تھا، اس سے وہ مطمئن نہ تھے اور نہ اسے ان کے شایان شان تصور کرتے تھے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں بھی مولانا پر جو مضامین و مقالات سپرد قلم کئے گئے ان میں بہت سی باتیں جو مولانا سعید انصاری قلم بند کرنا چاہتے تھے وہ رہ گئیں، مثلاً علاء الدین پٹی کی اجمالی تاریخ، ابتدائی حالات اور تعلیمی احوال وغیرہ۔

ایک خط میں انہوں نے عبدالسلام نمبر اور اس کے مضمون نگاروں پر بڑی تند و تیز تنقید کی ہے، جو مولانا عبدالسلام ندوی سے ان کی بڑھی ہوئی عقیدت کا مظہر ہے۔ دراصل وہ مولانا کے بہت بڑے عقیدت مند تھے اور ان پر کسی قسم کی تنقید یا ان کے مقام و مرتبہ میں کسی قسم کی کمی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان سے بڑا مداح عبدالسلام ندوی اب تک پیدا نہیں ہوا۔

ضرورت ہے کہ مولانا سعید انصاری کے مسودہ حیات عبدالسلام ندوی کی تلاش کے لئے تگ و دو کی جائے، ممکن ہے لاہور میں وہ کہیں محفوظ ہو۔؟ یقیناً یہ اپنی نوعیت کا ایک اہم اور مفید کام ہوگا جس سے مولانا عبدالسلام ندوی کی حیات و خدمات، افکار و خیالات اور ان کے مقام و مرتبے کی تعیین میں مدد ملے گی۔

حواشی

(۱) ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ مولانا سعید انصاری نشتر، ماہنامہ معارف اگست ۲۰۰۸ء

(۲) سعید انصاری، غزلیات فارسی۔ شبلی مرکز لاہور ۱۹۵۶ء

(۳) شبلی کالج میگزین اعظم گڑھ۔ ۵۹۔۱۹۵۸ء۔ ص ۲۶۔۲۷

(۴) ایضاً

ایک عقیدت مند

پروفیسر کبیر احمد جائسی

پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم اردو کے ممتاز اہل قلم، مصنف، محقق، ادیب، شاعر اور نقاد تھے۔ اردو شعر و ادب کے ساتھ فارسی و تاجیکی ادبیات پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ تقریباً دو درجن محققانہ اور بلند پایہ کتابیں اور تراجم ان کے گہرے علم و مطالعہ اور دقت نظری کا ثبوت ہیں۔ ۷؍ جنوری ۲۰۱۳ء کو انہوں نے وفات پائی تو ان کی نوجوانی کا یہ شعر:

یہ اور بات ہے صبا بھلا دیں اہل انجمن مجھے
بساط میں جو میری تھا وہ میں جہاں کو دے گیا

بڑا سچا لگا۔ واقعی ان کی بساط میں جو کچھ تھا وہ جہاں کو دے گئے۔ ان کی بساط میں ان کی عبدالسلام شناسی بھی شامل ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی کتاب زندگی کا یہ بہت خوب صورت ورق ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی، علامہ شبلی کے عبقری اور جینیس شاگرد تھے۔ ادیب و انشا پرداز، نقاد اور ایک بڑے مصنف کی حیثیت سے ان کا درجہ مسلم ہے۔ انہوں نے علم و فن کی بڑی نمایاں خدمات انجام دیں اور ہمارے ادبی ذخیرے میں گراں قدر اضافہ کیا، جسے ہماری ادبی تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

مولانا کا عہد شباب ندوہ اور الہلال میں گذرا، پھر وہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ آ گئے۔ یہاں ۴۲؍سال مسلسل سرگرم عمل رہنے کے بعد ۴؍اکتوبر ۱۹۵۶ء میں اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔ انہوں نے جس وقت وفات پائی ان کے ادب و انشاء کی رعنائی کا شہرہ نصف النہار پر تھا۔ رام بابو سکسینہ اپنی مشہور کتاب تاریخ ادب اردو میں ان کے شعر و ادب کا ذکر کر چکے تھے۔ بابائے اردو

مولوی عبدالحق سے کلیم الدین احمد تک ممتاز نقادوں کے نوک قلم پر ان کی ادبی وتنقیدی کاوشوں کا ذکر آ چکا تھا۔ اسی دور آخر میں پروفیسر کبیر احمد جائسی ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کے قریب آئے اور اس طرح قریب آئے کہ پھر کبھی ان کی قربت وعقیدت میں کمی واقع نہ ہوئی۔

پروفیسر کبیر احمد جائسی اگرچہ قصبہ جائس [رائے بریلی] میں پیدا ہوئے مگر ان کی نشوونما شہر اعظم گڑھ میں ہوئی۔ یہاں ان کے والد ظہیر احمد ڈسٹرکٹ بورڈ میں ورسیر تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ باغ میر پیٹو، اعظم گڑھ میں ہوئی۔ اس زمانہ میں علامہ شبلی کی یادگار شبلی نیشنل کالج اس علاقہ کے مسلمانوں کا واحد تعلیمی مرکز تھا۔ جائسی صاحب نے بھی اسی کے بام ودر کے درمیاں سانسیں لیں اور انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی اور بعد میں بجا طور پر اس کے نامور فرزند قرار پائے۔

جائسی صاحب میں ابتدا ہی سے شعروادب سے دلچسپی اور لکھنے پڑھنے کا ذوق تھا۔ کالج کے جن طلبہ میں یہ ذوق پروان چڑھتا ہے وہ شبلی کالج سے شبلی منزل کا سفر ضرور طے کر لیتے ہیں چنانچہ جائسی صاحب بھی شبلی منزل پہونچے اور آفتاب شبلی کی کرنوں کے درمیاں مطالعہ وکتب بنی کا مشغلہ قائم ہوا۔ اس وقت وہاں مولانا عبدالسلام ندوی علم وحلم کی شمع فروزاں بنے ہوئے تھے اور اپنی سادگی وشائستگی کی وجہ سے سب کی توجہ کا مرکز تھے۔ جائسی صاحب بھی ان کے علم وفضل سے متاثر ہوے بلکہ اس قدر متاثر ہوئے کہ ان پر ایک مضمون ''مولانا عبدالسلام ندوی اور ان کی شاعری'' لکھ ڈالا اور ہمت کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا خوش ہوئے، جا بہ جا اصلاح دی۔ یہ مضمون ان کی وفات کے بعد ماہنامہ آج کل [دسمبر ۱۹۵۶ء] میں شائع ہوا۔ یہ مولانا عبدالسلام ندوی پر پہلا باقاعدہ مضمون تھا، اس میں انہوں نے مولانا کی سیرت وشخصیت کے ذکر کے ساتھ ان کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے اور شاعری کے ضمن میں کثرت سے ان کے اشعار نقل کئے ہیں۔ اس وقت ممکن ہے کسی کو یہ بات ناگوار گذری ہو کہ اس کثرت سے اشعار نقل کرنے کی کیا ضرورت ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہی وہ مضمون ہے جس سے مولانا مرحوم کے بہت سے اشعار محفوظ رہ گئے۔ ورنہ بعد میں ان کی بیاض کا جو حشر ہوا اس کو دیکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ ہم ان کی شاعری ہی سے محروم ہو جاتے۔

پروفیسر جائسی کا یہ مضمون عبدالسلام شناسی کا نقطہ آغاز تو نہیں ہے کیوں کہ اس سے

پہلے بابائے اردو مولوی عبدالحق، کلیم الدین احمد اور نیاز فتح پوری عبدالسلام شناسی میں اپنا کردار ادا کر چکے تھے تاہم مثبت انداز میں ان کی شاعری کا یہ پہلا مطالعہ ضرور تھا۔ اس مضمون کے بارے میں شاہ معین الدین احمد ندوی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ یہ مولانا عبدالسلام ندوی کا لکھا ہوا ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہیں۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی نے اگرچہ اس کی تردید کی ہے تاہم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا مولانا عبدالسلام ندوی کی بے نیاز شخصیت پر یہ تہمت لگانا کہ انہوں نے خود اپنے اوپر مضمون لکھ کر ایک طالب علم کے نام سے چھپوانا پسند کیا کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ شاید یہی اعتراض تھا جس نے جائسی صاحب کی عقیدت میں عبدالسلام شناسی کا جذبہ موجزن کر دیا۔

۱۹۵۶ء میں مولانا عبدالسلام ندوی نے دار فانی سے دار بقا کا سفر کیا۔ جائسی صاحب اس زمانہ میں شبلی کالج کے سینئر طالب علم تھے۔ کئی ادبی مضامین لکھ چکے تھے، ان کی شاعری کا بھی آغاز ہو چکا تھا، چنانچہ ۱۹۵۸ء میں وہ شبلی کالج میگزین کے مدیر مقرر ہوئے اور ذاتی دلچسپی کی بنا پر انہوں نے میگزین کا ۵۹-۱۹۵۸ء کا شمارہ ''مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں'' شائع کیا۔ یہ مولانا پر کسی میگزین یا رسالے کا پہلا اور آخری خصوصی شمارہ ہے۔ اس کے بعد آج تک کسی مدیر کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ مکمل نمبر تو کجا ایک گوشہ ہی شائع کر دیتا۔ حتیٰ کہ ماہنامہ معارف نے بھی ان کو اس پہلو سے یاد نہیں رکھا جس میں انہوں نے کثرت سے مضامین ومقالات لکھے بلکہ ایک عرصہ تک انہی کے مقالات سے اس کا وقار قائم رہا۔

شبلی کالج میگزین کے اس خصوصی شمارہ میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ مولانا عبدالسلام ندوی۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

۲۔ حضرۃ الاستاذ مولانا عبدالسلام ندوی۔ مولانا سعید انصاری

۳۔ میرے مولوی صاحب۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

۴۔ مولانا عبدالسلام ندوی۔ میجر علی حماد عباسی

۵۔ شعر الہند: ایک جائزہ۔ کبیر احمد جائسی

بلاشبہ یہ بڑے عمدہ اور وقیع مضامین کا مجموعہ ہے۔ نگاہ اولیں میں میگزین کے ایڈیٹر

کبیر احمد جائسی نے لکھا کہ:

''مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی شخصیت اپنے تمام کمالات کے باوجود قابل اعتنا نہیں سمجھی گئی۔ان کی بے نیاز طبیعت اور فطری شرافت نے ان کو اتنا مشہور نہ ہونے دیا جتنا وہ مستحق تھے۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال کے بعد کسی ادارہ کو اس کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ ان کے کمالات کا جائزہ لے اور دنیا کو دکھلا دے کہ ان برسے ہوئے بادلوں میں بھی کتنی بجلیاں پوشیدہ ہیں۔مقام شکر ہے کہ شبلی کالج میگزین نے اس کی طرف توجہ کی اور جو کچھ ہو پایا وہ ہدیہ ناظرین ہے۔''(۱)

اس خصوصی اشاعت اور اس کی ترتیب کے لئے نوجوان مدیر کی متعدد بڑے اہل قلم مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا امین احسن اصلاحی اور نیاز فتح پوری نے تحسین وستائش کی۔اس خراج عقیدت کے بعد انہوں نے ذکر عبدالسلام کے لئے مواد جمع کرنے کی کوشش کی۔مولانا کے بڑے صاحبزادے اخلاق احمد قریشی پونہ سے جہاں وہ شعبہ تعلیمات میں ملازم تھے، اعظم گڑھ تشریف لائے اور شہر میں کسی عزیز کے یہاں قیام کیا تو جائسی صاحب نے ان سے مل کر ان کے نام مولانا کے خطوط وغیرہ حاصل کرنے چاہے مگر ان کا طرز عمل بڑا حوصلہ شکن رہا۔جائسی صاحب نے لکھا ہے کہ:

''غالباً ۱۹۵۹ء کی بات ہے مولانا عبدالسلام ندوی کے بڑے صاحبزادے اخلاق احمد قریشی مرحوم شہر اعظم گڑھ آئے اور اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں قیام پذیر تھے۔ میں ان صاحب کا مکان تلاش کرتے کرتے بصد دقت منزل مقصود تک پہونچا اور اپنا تعارف ''مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں'' کے مرتب کی حیثیت سے کرایا۔پھر عرض مطلب کرتے ہوئے ان سے خطوط کی نقول کا طلب گار ہوا جو مولانا عبدالسلام ندوی نے ان کو لکھے تھے۔اخلاق صاحب نے فوراً جواب دیا کہ میں ان خطوط کو آپ کو نہیں دوں گا کیوں کہ ان میں بعض ایسی باتوں کا ذکر ہے جن پر ابا نے زندگی بھر

خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد میں ان باتوں کو ہمیشہ
کے لئے بھول جانا چاہتا ہوں۔''(۲)

پروفیسر جائسی اس حوصلہ شکنی کے باوجود مایوس نہیں ہوئے۔ بلکہ ان کے احباب کو خطوط لکھ کر دور طالب علمی کے حالات اور ان کے تاثرات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مولانا سید ابوظفر ندوی جو مولانا کے ندوہ کے زمانہ طالب علمی کے احباب میں تھے اور اس وقت گجرات مہاودیالے میں پروفیسر تھے ان کو خط لکھ کر زمانہ ندوہ کے حالات جاننے چاہے تو انہوں نے ان کے خط کے جواب میں لکھا کہ:

''مولوی عبدالسلام ندوی ندوہ میں ایک ہی بورڈنگ میں ہم دونوں رہتے
تھے۔ مجھ سے وہ صرف ایک سال سینئر تھے۔ اعظم گڑھ میں تقریباً دو تین
سال ایک جگہ کام کرتے رہے لیکن ہم دونوں میں ایک خصلت مشترک تھی
ورنہ وہ ہر بات میں مجھ سے الگ اپنا راستہ رکھتے تھے اور وہ خصلت
انفرادیت ہے۔ یعنی سب سے الگ تھلگ رہنا اور اسی سبب سے نہ مجھ
سے وہ مانوس ہوئے نہ ہم ان سے۔''(۳)

اس مایوس کن جواب سے کبیر احمد جائسی صاحب کی حوصلہ شکنی ہوئی اور انہوں نے اپنی تلاش وجستجو کا کام ترک کر دیا لیکن چار برس بعد عقیدت عبدالسلام پھر عود کر آئی۔ اور مولانا عبدالسلام ندوی کے ایک اور دوست مولانا عبدالباری ندوی فلسفی کے خیالات اور تاثرات جاننے کی فکر ہوئی اور انہوں نے خط کے ذریعہ مولانا عبدالسلام ندوی کی طالب علمانہ زندگی کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ:

''کرم نامے نے ایک ایسے مرحوم صاحب علم وقلم دوست کی یاد تازہ
فرمادی جن کو پچاس سال سے زاید کے زمانے .... مدتوں قریب
سے تعلق کے باوجود ''دوست'' کہنا مشکل ہے۔
کچھ ایسی استثنائی، بے ہمہ طبیعت پائی تھی کہ شاید ہی کسی سے دلی دوستی کا
لگاؤ رہا ہو، رسوم وتکلفات سے بھی اتنے آزاد تھے کہ حضرت والد مرحوم

اور بھائی مرحوم کی وفات پر جو تعزیت نامہ آیا تھا صاف معلوم ہوتا تھا کہ
صرف ''مروت'' کا حق ادا فرمایا ہے۔ شاید ایسا ہی کبھی کسی شدید بیماری
کے سلسلہ میں پرسش نامہ مل گیا ہو۔ تاہم پچاس سال کے دوران میں
پانچ کی تعداد بھی یقیناً پوری نہ ہوئی ہوگی۔''(۴)

ان مایوس کن جوابات نے جائسی صاحب کے حوصلہ کو پست نہیں کیا بلکہ وہ ان کی سوانح زندگی سے متعلق مواد اور معلومات جمع کرتے رہے جو بعد میں ان کی کتابوں میں شامل ہوئے۔

اسی زمانہ میں انہوں نے نیاز فتح پوری کے رسالہ نگار [اگست، ستمبر ۱۹۵۹ء] دو قسطوں میں مولانا کی شخصیت پر مقالہ لکھا جسے بے حد پسند کیا گیا۔

شبلی نیشنل کالج کے بعد جائسی صاحب علی گڑھ پہونچے۔ یہاں وہ طالب علم بھی رہے اور استاذ بھی۔ ماہنامہ ادیب، کانفرنس گزٹ اور تہذیب الاخلاق کی ادارت بھی سنبھالی اور اسلامک اسٹڈیز کی سربراہی بھی مگر وہ ایک لمحہ کے لئے بھی مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد سے غافل نہیں ہوئے۔

ماہنامہ ادیب علی گڑھ ستمبر ۱۹۶۰ء کا شمارہ ''شبلی نمبر'' کی شکل میں شائع ہوا جو آج تک اہل علم کو یاد ہے۔ یہ خصوصی شمارہ کسی تصنیف سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس میں مولانا عبدالسلام ندوی کا بھی ایک گراں قدر مقالہ [شبلی کا طرز تحریر] شامل ہے۔ جائسی صاحب اس کے معاون مدیر تھے ایک سال بعد ڈاکٹر ابن فرید نے ماہنامہ ادیب کا عبدالسلام ندوی نمبر ''ذکر عبدالسلام'' نکالا، جو اصلاً جائسی صاحب کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اسے خصوصی شمارے کے بجائے جائسی صاحب کی کتاب کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ مولانا عبدالسلام ندوی پر یہ پہلا مفصل مقالہ تھا، یہی وجہ ہے کہ ''ذکر عبدالسلام'' کی داد مولانا سید احمد عروج قادری اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے دی۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا کہ

''کبیر احمد جائسی کا یہ مقالہ مولانا عبدالسلام ندوی کی شخصیت، ان کے طرز
فکر، اسلوب بیان اور ان کی علمی و ادبی خدمات کو ایک رشتے میں منسلک
کرکے سامنے لاتا ہے۔ مقالہ نگار نے مرحوم کے تعارف کا حق ادا کر دیا

ہے۔"(۵)

علی گڑھ میں جائسی صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس کے ترجمان کانفرنس گزٹ کے مدیر نہ ہونے کے باوجود مسلسل اداریے لکھے اور اس کو مرتب کرتے رہے۔اس میں بھی انہوں نے مولانا کو فراموش نہیں کیا اور ۱۹۷۳ء[ج اش۱۳] میں ایک عمدہ مقالہ لکھا۔پھر وہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر سے وابستہ ہو کر سری نگر گئے تو رسالہ تعمیر سری نگر میں مولانا عبدالسلام ندوی کی نثر نگاری پر مفصل مقالہ لکھا اور ان کی نثر نگاری کی خصوصیات وامتیازات کو اجاگر کیا۔

ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی سربراہی کے زمانہ میں جب وہ ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے معاون مدیر پھر مدیر مقرر ہوئے تو مولانا پر کئی مضامین شائع کئے اور ایک شمارے کا اداریہ مولانا کی عظمت وشخصیت پر لکھا۔یہی نہیں انہوں نے مولانا پر بعض تحقیقی مقالے بھی لکھوائے۔غضنفر علی کا انگریزی مقالہ Maulana Abdus Salam Nadvi And His Contribution To Islamic Studies جو انہوں نے ایم فل.کے لئے لکھا ہے۔اصلاً انہیں کی کوشش کا نتیجہ تھا۔غضنفر علی نے کتاب کے دیباچے میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔یہ کتاب ۱۹۹۵ء میں خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے شائع ہو چکی ہے۔

اس سلسلے کی ان کی دوسری کاوش ڈاکٹر شباب الدین صاحب صدر شعبہ اردو شبلی نیشنل پی.جی کالج اعظم گڑھ کا تحقیقی مقالہ عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات بھی ہے۔جو انہوں نے مسلم یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لئے لکھا تھا اور جسے شبلی کالج کے شعبہ اردو نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔یہ مولانا عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات پر بڑا وقیع، جامع اور مبسوط کام ہے۔یہ بھی اصلاً ہمارے جائسی صاحب ہی کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

ان کے علاوہ بھی انہوں نے کئی طلبہ کو مولانا عبدالسلام ندوی پر کام کے لئے تیار کرنا چاہا تاہم اس میں ان کو کامیابی نہیں ملی۔لیکن وہ اس کے لئے مدۃ العمر کوشاں رہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کے بعض اعزہ بالخصوص جناب محمد ہارون اعظمی نے ممبئ میں مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن قائم کیا تو وہ اس میں بھی شریک رہے۔برابر مفید اور کارآمد مشورے دیتے رہے۔اس کے اشاعتی منصوبے اصلاً در پردہ انہیں کے تھے۔اس سلسلے میں کئی علمی

کام انجام پائے۔کئی کتابیں شائع ہوئیں۔فاؤنڈیشن نے دوسمینار منعقد کئے،ان سب میں جائسی صاحب کا حصہ رہا۔ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود فاؤنڈیشن کے دونوں سمیناروں میں وہ شریک ہوئے۔مقالے پڑھے،صدارت کی اور اپنے آراء و خیالات سے مستفید کیا۔پہلا سمینار جو بمبئی میں منعقد ہوا تھا راقم اس میں شریک تھا۔اس میں جائسی صاحب نے جو مقالہ پیش کیا تھا اس میں مولانا مرحوم کی سات غیر مطبوعہ کتابوں کا ذکر کیا تھا اور ان کے حصول و اشاعت پر زور دیا۔ان سات کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔دلائل الفرقان

۲۔اعجاز القرآن

۳۔تاریخ اخلاق اسلامی حصہ دوم

۴۔تاریخ التنقید

۵۔شعر العرب

۶۔ہندوستان کی تمدنی تاریخ

۷۔ایک کارآمد مجموعہ حدیث

ان کتابوں کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ وہ مکمل تھیں اور انہیں شائع نہیں کیا گیا۔ خدا جانے دارالمصنّفین کے اس وقت کے ناظم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے انہیں کیوں شائع نہیں کیا اور انہیں وہ نامکمل بتاتے رہے۔البتہ آخر الذکر تینوں کتابوں میں ہندوستان کی تمدنی تاریخ کو دارالمصنّفین نے علاحدہ شائع نہ کر کے ''ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے'' میں شائع کر دیا ہے۔شعر العرب واقعی مکمل نہیں ہے لیکن جائسی صاحب اسے بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ان کا خیال تھا کہ مولانا کے مسودے کو مدیران معارف مضامین بنا بنا کر شائع کرتے رہے اور مکمل کتاب شائع نہیں کی۔پروفیسر جائسی صاحب اپنے اس موقف پر ہمیشہ قائم رہے اور یہی وجہ ہے کہ دارالمصنّفین کے اس وقت کے ارباب حل وعقد سے ان کے مراسم بہت اچھے نہیں رہے۔تاہم ایک وقت یہ بھی آیا کہ انہیں لکھنا پڑا:

''بہرحال اب اردو دنیا کو مولانا عبدالسلام ندوی کی غیر مطبوعہ کتابوں کو

بھول جانا چاہئے۔ پچاس برسوں میں ان کی کتابوں کا سراغ نہ ملا تو اب
ملنے کی کیا امید؟''(۶)

اس کرب و مایوسی میں ان کی کتنی آہیں پوشیدہ ہیں۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے انہیں ہر سانس میں مولانا عبدالسلام ندوی کے گن گاتے ہوئے دیکھا اور سنا ہے۔

بعض لوگوں کو میں نے ان پر یہ تنقید کرتے ہوئے سنا ہے کہ وہ مولانا عبدالسلام ندوی کا نام لے لے کر اپنی شخصیت بناتے رہے لیکن یہ قطعی طور پر غلط ہے۔ ایک ایسے شخص پر کام کرنا اور کرانا جس کو اس کی زندگی ہی میں فراموش کر دیا گیا ہو اور جسے اس کے اپنے ادارے نے نظر انداز کر دیا ہو اور جس کے اعزہ و اقرباء خود اسی کی طرح بے نیاز ہوں۔ ان سے اس طرح کی توقع اور تنقید بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر جائسی کی رگ رگ میں مولانا عبدالسلام ندوی کی محبت و عقیدت پیوست ہو گئی تھی۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں آ چکا ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن سے انہوں نے بڑی دلچسپی لی اور اس سے کئی کتابیں شائع کرائیں۔ ان میں ایک کتاب ''مکاتیب و اشعار مولانا عبدالسلام ندوی'' بھی ہے۔ اس میں انہوں نے زندگی بھر تلاش و جستجو کے بعد جو مکاتیب و اشعار ہاتھ آئے تھے انہیں یکجا کر دیا ہے۔ ایک گراں قدر مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اس میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ انہوں نے مولانا کی مکتوب نگاری پر روشنی نہیں ڈالی ہے محض وضاحتی نوٹ لکھے ہیں۔ یہی حال حصہ شعر کا بھی ہے۔ البتہ اس میں مولانا عبدالسلام ندوی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر کا عکس شائع کیا ہے، جس میں انہوں نے مولوی عبدالباقی صاحب کی جو اعظم گڑھ میں اسمبلی انتخابات میں کانگریس کے امیدوار تھے، کی حمایت میں لکھی ہے۔ اس سے پروفیسر جائسی کی تلاش و جستجو کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

پروفیسر جائسی مدۃ العمر اس بات کے خواہش مند رہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی کے اہم مقالات کے مجموعے شائع کئے جائیں اور ان کے جو طویل اور مسلسل مضامین ماہنامہ معارف وغیرہ رسائل میں شائع ہوئے ہیں ان کو مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ خود انہوں نے مولانا کا طویل مضمون ''مولانا کاتبی نیشاپوری'' مرتب کیا اور گراں قدر مقدمہ کے

ساتھ مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن سے شائع کرایا۔

مولانا کاتبی نیشاپوری فارسی کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔ ایک صاحب ذوق سید وزارت علی نے کاتبی کے کلام کا انتخاب کیا اور اس پر مولانا عبدالسلام ندوی سے مقدمہ لکھوایا۔ یہی مقدمہ معارف میں [جولائی تا ستمبر ۱۹۴۰ء] شائع ہوا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اس مقدمہ میں لکھا ہے کہ

> ''فارسی شاعری کی سب سے زیادہ مفصل تاریخ مولانا شبلی علیہ الرحمہ کی کتاب شعرالعجم ہے لیکن اس کتاب میں مولانا نے فارسی شاعری کے ایک خاص دور کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے یعنی قدماء کے بعد انہوں نے اس کتاب کے دوسرے حصہ میں صرف ساتویں صدی تک کے شعراء کے حالات لکھے ہیں جن میں کمال اسماعیل، سلمان ساوجی اور خواجہ حافظ وغیرہ زیادہ ممتاز ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے آٹھویں اور نویں صدی کے شعراء کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور اس کتاب کے تیسرے حصے میں صرف ان شعراء کو لیا ہے جو ان دونوں صدیوں کے بعد ۱۰۰۰ھ یا اس کے بعد پیدا ہوئے۔''

مولانا سید سلیمان ندوی نے اس مقدمہ کو ماہنامہ معارف میں شائع کرتے ہوئے جو نوٹ لکھا ہے اس میں اپنے استاذ علامہ شبلی کی اس کمی کا جس کی نشاندہی مولانا عبدالسلام ندوی کی تھی اس کی تائید کی ہے۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی اس سے اتفاق نہیں کرتے بلکہ لکھتے ہیں:

> ''جب ہم شعرالعجم جلد دوم پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سلمان ساوجی، حافظ شیرازی اور ابن یمین آٹھویں صدی ہجری کے شاعر ہیں، اس لئے مولانا عبدالسلام ندوی کے جملے میں آٹھویں صدی کا لفظ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے اس کو نکال دینا چاہئے۔ علاوہ بریں مولانا عبدالسلام ندوی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ اس کتاب کے تیسرے حصے میں صرف ان شعرا کو لیا ہے جو ان دونوں صدیوں کے بعد ۱۰۰۰ھ میں یا اس کے بعد پیدا

ہوئے۔ جب ہم شعرالعجم جلدسوم پرنظر ڈالتے ہیں تو یہ بات بھی درست معلوم نہیں ہوتی ۔اس جلد میں فغانی (م: ۹۲۵ھ) فیضی (م:۱۰۰۴ھ) عرفی (م:۹۹۹ھ) نظیری (م:۱۰۲۳ھ) طالب آملی (م:۱۰۳۶ھ) صائب (م:۱۰۶۶) اور کلیم (م:۱۰۶۱ھ) کی شاعری کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔فغانی فیضی اور عرفی تو یقیناً ۱۰۰۰ھ سے پہلے پیدا ہوئے تھے، اس لئے یہ کہنا درست نہیں معلوم نہیں ہوتا کہ علامہ شبلی نے شعرالعجم کی تیسری جلد میں صرف ان شعراء کا تذکرہ کیا ہے جو ۱۰۰۰ھ یا اس کے بعد پیدا ہوئے یہی حقیقت مولانا سید سلیمان ندوی کی تحریر کو بھی اصلاح طلب قرار دیتی ہے۔''(۷)

مولانا عبدالسلام ندوی کے نقطہ نظر کی اس تردید سے پروفیسر کبیر احمد جائسی کے بارے میں یہ خیال قائم ہوتا ہے کہ وہ مولانا کے نرے معتقد نہ تھے بلکہ وہ اپنے مطالعہ ومشاہدہ کی بنا پر بھی ان کے علم وفضل کے شناسا اور مداح تھے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کا ایک طویل اور بیش قیمت مقالہ تصوف کی اجمالی تاریخ اور اس پر نقد و بحث ماہنامہ معارف کے کئی شماروں میں شائع ہوا تھا، جائسی صاحب نے اسے بھی مرتب کر کے شائع کیا۔ یہ تصوف پر ایک بڑا عمدہ مقالہ ہے،ضرورت ہے کہ اسے اہل علم تک پہونچا کر نئے سرے سے نقد و بحث کا آغاز کیا جائے۔اس طرح کے طویل مقالات کی جمع وتدوین کے لئے جائسی صاحب آخری سانس تک فکر مند رہے۔دسمبر۲۰۱۲ء میں کم از کم تین بار انہوں نے راقم کو فون کر کے مولانا کے ایک طویل مضمون ''اردو شاعری اور فن تنقید'' کو مرتب کر کے شائع کرنے کا حکم دیا۔انتقال سے محض دو روز پہلے بھی ۵؍جنوری کی شام کو انہوں نے یاددہانی کے لئے فون کیا اور خواہش کی کہ تم فوراً اسے مرتب کر کے مقدمہ کے ساتھ میرے پاس بھیج دو۔افسوس کہ میں یہ کام میں اب تک نہ کرسکا۔خدا اسے کرنے کی توفیق بخشے۔

عبدالسلام شناسی کے سلسلے کی ان کی ایک اہم کاوش ان کی کتاب ''مولانا عبدالسلام ندوی'' بھی ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں نہ آسکا۔ یہ اصلاً ساہتیہ اکادمی کے سلسلہ ہندوستانی ادب

کے معمار کے تحت لکھی گئی اور اکادمی ہی سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مولانا عبدالسلام ندوی کے نقش حیات، تصنیفات، شاعری اور مطبوعہ کتابوں کا تعارف و تذکرہ بڑی جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان کی انفرادیت اور خصوصیات اور شعر وادب میں ان کے کمالات کا ذکر بڑے سلیقہ سے کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں مولانا کی شخصیت کا ایک جامع مرقع آ گیا ہے۔

چونکہ ساہتیہ اکادمی ایک مخصوص حجم کی کتابیں شائع کرتی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ بعد میں جائسی صاحب نے اس میں اس قدر اضافہ کیا کہ وہ ضخیم کتاب کی شکل میں مکتبہ قرطاس کراچی سے شائع ہوا۔ چند دن پہلے اسی کتاب کو مولانا عبدالسلام فاؤنڈیشن نے بھی شائع کر دیا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی ہماری ادبی تاریخ کا ایک زندہ جاوید نام ہے۔ انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، بالکل اسی طرح عبدالسلام شناسی میں پروفیسر کبیر احمد جائسی کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عبدالسلام شناسی کے میدان میں ان کی تگ و دو، جدوجہد اور کاوشیں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ آئندہ جب بھی مولانا عبدالسلام ندوی پر کوئی قلم اٹھائے گا وہ جائسی صاحب کی شیریں دیوانگی اور مقدس سنجیدگی کو نظر انداز نہ کر سکے گا۔

حوالے

(۱) مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں، نگاہ اولیں

(۲) مکاتیب واشعار ص ۶

(۳) بحوالہ مولانا عبدالسلام ندوی ص ۱۵

(۴) بحوالہ مولانا عبدالسلام ندوی ص ۱۶

(۵) کبیر احمد جائسی کی علمی وادبی خدمات ص ۲۲۵

(۶) مکاتیب واشعار ص ۹

(۷) مقدمہ مولانا کاتبی نیشاپوری ص ۹

ہندو پاک میں عبدالسلام شناسی

مولانا عبدالسلام ندوی عہد شباب میں ایک شاعر کی حیثیت سے نمایاں ہوئے تھے۔ وہ جب مولوی محبوب الرحمٰن کلیم کے ساتھ آگرہ میں زیر تعلیم تھے، وہاں کے بعض مشاعروں میں شریک ہوئے۔ ایک مشاعرے میں ان کے بعض اشعار کی مرزا خادم حسین رئیس نے تحسین و ستائش کی۔ پھر وہ غازی پور آئے، یہاں شمشاد لکھنوی نے ان کی شاعری کو سراہا۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا تحصیل علم کے لئے ندوہ پہنچے۔ یہاں انہوں نے شاعری کے کوچے سے قدم باہر نکالا اور نثر کی طرف مائل ہوئے۔ ندوہ میں علامہ شبلی نے ان کی تحریری صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ انہوں نے اپنے بعض دوستوں کے نام خطوط میں ان کو ہونہار لکھا اور مصنف ہونے کی پیش گوئی کی اور پھر ان کی صلاحیتوں ہی کی بنیاد پر ماہنامہ الندوہ کا نائب ایڈیٹر مقرر کیا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام خطوط لکھے ہیں جو نقوش لاہور کے مکاتیب نمبر میں شائع ہوئے اور جنہیں بعد میں پروفیسر کبیر احمد جائسی نے اپنی کتاب ''مکاتیب و اشعار مولانا عبدالسلام ندوی'' میں شامل کیا ہے۔ جس زمانہ میں مولانا شبلی سیرۃ النبیؐ کی تالیف و تدوین کے عظیم الشان منصوبہ پر کام کر رہے تھے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کو اپنا لٹریری اسسٹنٹ بنا کر ساتھ رکھا، بمبئی کے سفر پر لے گئے۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے سیرت کے لئے مواد جمع کرنے میں ان کا تعاون کیا۔ مولانا شبلی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عبدالسلام ندوی وسیع النظر ہیں اور ان میں استخراج کا پورا ملکہ ہے۔ (۱) ماہنامہ الندوہ یا کسی اور مجلّہ یا مجموعہ خطوط سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس دور میں مولانا عبدالسلام ندوی سے کسی اور شخصیت نے اعتنا کیا ہو۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی ادبی اور تصنیفی صلاحیتوں پر مولانا شبلی کے بعد اگر کسی شخصیت نے اعتماد کیا تو وہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی نابغہ روزگار شخصیت تھی۔ انہوں نے مولانا

عبدالسلام ندوی کو الہلال سے وابستہ کرنا چاہا اور اس سلسلہ میں علامہ شبلی سے خط و کتابت کی اور پھر انہیں راضی کر کے مولانا کو الہلال سے وابستہ کر لیا۔ مولانا آزاد آخری دم تک ان کے کمالات کے معترف و مداح رہے۔ انہیں کی وجہ سے الہلال میں ایک نئے کالم ''فلسفہ'' کا آغاز کیا اور لکھا کہ:

''الہلال میں آج ایک نئے باب کا بعنوان ''فلسفہ'' افتتاح کیا جاتا ہے۔ اس باب کی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس کے تحت جس قدر مضامین شائع ہوں گے انہیں ہر طرح کے معتقدات و آراء سے الگ رکھا جائے گا اور کوشش کی جائے گی محور فکر صرف فلسفۂ اجتماع ہو۔

ضمناً یہ امر بھی پیش نظر رہے گا کہ اجتماعی فلسفیانہ مباحث کے لئے ایک نئے طرز بیان و انشاء کا نمونہ پیش کیا جائے گا!! بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ فلسفیانہ مضامین وہی ہو سکتے ہیں جن کی عبارت روکھی پھیکی اور بے مزہ ہو، اگر ایسا نہیں ہے تو فلسفیانہ استدلال و نظر سے بالکل خالی سمجھنا چاہئے مگر ہمارے خیال میں یہ قلمی پست ہمتی، کم از کم ان لوگوں کے لئے جائز نہیں رکھی جا سکتی۔ جنہیں خدا تعالیٰ نے اپنے ہر طرح کے افکار کو بہتر لفظ اور مؤثر فصاحت کے ساتھ بیان کرنے کی قدرت دی ہے!! **وذٰلک فضلُ اللّٰہ یوتیہ من یشاءُ!** اور ان پر بلاغت قرآنی کے درس وافادہ سے فیضانِ بیان کا ایک ایسا دروازہ کھول دیا ہے کہ دقیق سے دقیق خشک مطالب کو بھی وہ حسن و عشق کی دلچسپ داستاں بنا دے سکتے ہیں!!

آں نیست کہ صحرائے سخن جادہ ندارد
واژوں روش کج نظری راچہ کند کس(۲)

مولانا عبدالسلام ندوی نے الفرق کے حوالے سے ایک مضمون لکھا تو مولانا آزاد نے سید صاحب کو یوں مخاطب کیا:

''آپ ہمارے مولوی عبدالسلام کے حسن اخذ، ترتیب و تزئین مطالب کا سلیقہ دیکھتے ہیں۔ صرف بغدادی کی ایک کتاب ''الفرق'' سے ایک اچھا

خاصا مضمون تیار کر لیا ہے چونکہ اس میں بعض تفصیلات نئی ملتی ہیں، اس لئے ہمیشہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اس پر ریویو لکھا جائے لیکن مولانا عبدالسلام صاحب نے ایک مستقل مضمون تیار کر لیا۔'' (۳)

۱۹۱۸ء میں انقلاب الامم شائع ہوئی تو انہوں نے لکھا کہ مولانا عبدالسلام صاحب نے اس قدر بلیغ ترجمہ کیا ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔'' (۴)

مولانا عبدالسلام ندوی علامہ شبلی کی وفات کے بعد جب دارالمصنّفین سے وابستہ ہوئے اور کتابوں پر کتابیں لکھیں اور مضامین نو کا انبار لگا دیا تو ان کی علمی شہرت وعظمت کا ڈنکا تمام علمی دنیا میں بجا اور علی العموم ان کے کمالات کا اعتراف کیا گیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ابن خلدون کے دیباچے میں ان کے علم وفضل اور سلیقہ تصنیف وتالیف وترجمہ کی داد دی۔ حیات شبلی میں ان کا جا بجا ذکر کیا۔ اس کے علاوہ ماہنامہ معارف میں ان کے مقالات، تراجم اور غزلیں شائع کرتے ہوئے نوٹ کی شکل میں بھی ان کے علمی وادبی کمالات کا ذکر اعتراف کیا ہے۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۲ء کے درمیان مولانا عبدالسلام ندوی کی اسوۂ صحابہؓ وصحابیاتؓ جیسی اہم کتابیں شائع ہوئیں جن کی شہرت ملک کے علمی حلقوں میں خاص طور سے پہونچی چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اسوۂ صحابہؓ پر باب التقریظ والانتقاد کے تحت ایک مفصل تنقیدی تبصرہ ماہنامہ معارف [جولائی ۱۹۲۲ء] میں لکھا جس میں مولانا کے وسعت مطالعہ اور بلند ذوق تصنیف و تالیف کی تحسین وستائش کی ہے۔ اس کا آغاز انہوں نے اس طرح کیا ہے:

> ''اسوہ صحابہ، اسوہ رسول کا لازمی ضمیمہ ہے۔ سیرت رسول کے تکملہ کی سعادت شبلی کے جانشین کے نصیب میں آچکی ہے، سیر الصحابہ کی تحریر کا شرف اسی خرمن کمال کے ایک دوسرے خوشہ چیں کے حصے میں آیا۔ مبارک تھا وہ استاذ جسے ایسے تلامذہ ملے۔ مبارک ہیں یہ تلامذہ جنہیں ایسا استاد نصیب ہوا۔ مولوی عبدالسلام صاحب کے قلم سے دائرہ معارف کا کوئی شخص نامانوس نہیں ہوسکتا، اسوہ صحابہ انہیں کے تازہ افادات سے ہے۔'' [معارف جولائی ۱۹۲۲ء ص ۱۴۹]

۱۹۲۵ء میں مولانا کی دوسری معرکہ آراء کتاب شعرالہند شائع ہوئی۔ یہ اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب تھی یہی وجہ ہے کہ ارباب شعروادب کے درمیان اس کتاب نے بڑی مقبولیت پائی اور اس پر بڑے نقد وتبصرے لکھے گئے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس پر طرح طرح کی تنقیدیں کیں۔لیکن پھر یہ بھی لکھا کہ:

''فاضل مؤلف نے اردو شاعری کے دو مختلف اسکول دلی اور لکھنؤ پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس تفصیل سے اب تک کسی تذکرہ نویس یا مؤلف نے بحث نہیں کی تھی۔''(۵)

مگر علی جواد زیدی نے اس کو قابل نقد قرار دیا اور لکھا ہے کہ:

''مؤلف شعرالہند نے ایک ستم یہ بھی کیا کہ لکھنؤ اور دلی اسکولوں کی قد آدم دیواریں کھڑی کر دیں۔ اسکول سازی کا یہ کام بہت ہی غیر علمی طریقے پر ہوا۔ بعد میں آنے والے رویے برقرار رہ گئے اور اس کے اثرات ان تصانیف پر بھی نمایاں ہیں جو بہت بعد میں لکھی گئیں۔''(۶)

کلیم الدین احمد کی مشہور کتاب اردو تنقید پر ایک نظر شائع ہوئی تو اس میں انہوں نے بھی شعرالہند پر بڑی سخت تنقیدیں کیں اور لکھا کہ:

''عبدالسلام صاحب میں حالی کے محدود اوصاف بھی نہیں، آزادی فکر، حساس طبیعت، سخن فہمی، سمجھ بوجھ کچھ بھی نہیں۔ ان کا دماغ گنجلک واقع ہوا ہے۔ وہ سیدھی سادی بات کو سیدھے سادے طور پر بیان نہیں کر سکتے۔ طبیعت میں کچھ ایسی پراگندگی ہے کہ صفائی، ترتیب، تناسب کسی شے کا پتہ نہیں۔ اس کتاب کو پڑھنا گویا جہاد کرنا ہے لیکن اس جہاد سے کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہیں۔''(۷)

اور آخر میں اس نتیجے پر پہونچے کہ:

''عبدالسلام صاحب بنیادی چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ وہ قدیم تذکرہ نویسوں کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور ان کی کتاب گویا پرانی تنقید

کی تکمیل ہے۔''(۸)

اس جارحانہ نقد و انتقاد سے واضح ہوتا ہے کہ شعرالہند محض خامیوں کا مجموعہ ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ نہیں چونکہ کلیم الدین احمد کے جارح ذہن نے انہیں سوچنے کا موقع نہیں دیا ورنہ یہ حقیقت ان کے سامنے ضرور آجاتی کہ شعرالہند کا اسلوب ہی سنجیدہ و شائستہ ہے اور مولانا کے پیش نظر وہ مقاصد تھے ہی نہیں، جن کی توقع کلیم الدین احمد نے کی ہے۔ عبدالسلام صاحب نے کہیں جدید تنقید کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ شعرالہند لکھتے ہوئے جدید تنقید کے اصول ونظریات ان کے پیش نظر تھے لیکن کلیم الدین احمد کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے کہ شعرالہند قدیم تنقید کی تکمیل ہے۔

اسی طرح فیض الرحمٰن اعظمی نے شعرالہند کا ادبی درجہ متعین کرنے کی کوشش کی۔ لا طائل اور دراز کار بحث وتحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہونچے کہ:

> ''اردو ادب میں کیا بلحاظ تنقید اور کیا بلحاظ تذکرہ نگاری اور تاریخ ادب کے شعرالہند کا کوئی خاص درجہ نہیں، شعرالہند پرانی طرز تنقید سے آگے نہیں بڑھتی، غالبًا اسی لئے کلیم الدین احمد نے اسے پرانی تنقید کی تکمیل کہا ہے۔''(۹)

فیض الرحمٰن اعظمی کے خیالات سے اتفاق اس لئے ممکن نہیں کیونکہ شعرالہند بنیادی طور پر اردو شاعری کی تنقیدی تاریخ ہے جس میں عہد بہ عہد کے تغیرات وانقلابات کی نشاندہی مصنف کا بنیادی مقصد تھا۔ تنقید یا تذکرہ نگاری کے اصولوں کے پس منظر میں اس کا جائزہ لینے کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی اور صرف فیض الرحمٰن اعظمی ہی نہیں اس قبیل کے کئی ادیب اور نقاد اس غلط فہمی کا شکار رہوئے۔ نیاز فتح پوری نے بھی شعرالہند پر تبصرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''شعرالہند دیکھنے کے بعد ایک شخص مجموعی حیثیت سے جو رائے قائم کرسکتا ہے وہ یہی ہے کہ انہوں نے زیادہ تر اپنے معیار کے لحاظ سے تنقید کی ہے اور شاعر کے حقیقی رنگ پر اس کے خصوصی رنگ کی خصوصیت کے لحاظ سے کم غور کیا ہے۔''(۱۰)

مگر رام بابو سکسینہ کی معرکہ آرا کتاب تاریخ ادب اردو شائع ہوئی تو انہوں نے عظمت

عبدالسلام کا اعتراف ان لفظوں میں کیا:

''مولوی عبدالسلام ندوی کی ذات پر دارالمصنّفین کو جس قدر ناز ہو کم ہے، وہ وقتاً فوقتاً معارف میں نہایت اعلیٰ درجے کے مضامین لکھتے رہے ہیں۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز، اسوۂ صحابہ، صحابیات، شعرالہند اول و دوم وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ سنا ہے کہ مولانا شبلی کی زندگی کے حالات بھی مرتب کر رہے ہیں مگر وہ اب تک شائع نہیں ہوئی۔ شعرالہند میں جو نظم اردو کی ایک مبسوط تاریخ ہے ان اثرات و حالات کی جو مختلف اوقات میں نظم اردو پر مرتب ہوئے ہیں، مفصل اور نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اپنی نوعیت میں یہ کتاب بہت عمدہ اور قابل تعریف ہے اور اس کتاب کو تصنیف کر کے مصنف نے فی الحقیقت زبان اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔''(۱۱)

۴/اکتوبر ۱۹۵۶ء کو تقریباً ۷۴/سال کی عمر میں مولانا عبدالسلام ندوی نے وفات پائی تو علمی و ادبی دنیا سوگوار ہوگئی۔ اہل قلم نے وفیاتی مضامین اور بعض شعراء نے مرثیے لکھے۔ شعراء میں یحییٰ اعظمی، شان الرحمٰن ولی کاکوروی، عطا کاکوی اور قاضی معراج دھول پوری کے قطعات و مراثی ماہنامہ معارف (نومبر ۱۹۵۶ء) میں شائع ہوئے۔ معارف، برہان، آج کل، نیا دور، صدق جدید اور نوائے ادب بمبئی وغیرہ رسائل نے تعزیتی نوٹ اور وفیاتی مضامین لکھے۔ اس زمانہ کے بعض اخبارات میں بھی ان کے سانحہ وفات کی خبریں چھپیں اور ماتم کیا گیا۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے معارف میں لکھا کہ:

تو نظیری چو فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

''حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کا غم ابھی بھولا نہ تھا، مولانا مناظر احسن گیلانی کی یاد ابھی بالکل تازہ تھی کہ ایک اور قدیم اور اہم علمی یادگار مٹ گئی اور مولانا عبدالسلام ندوی نے ۳/اور ۴/اکتوبر کی درمیانی شب کو دفعتاً انتقال کیا۔ دارالمصنّفین کی پرانی بزمِ علمی کی یہی ایک شمع رہ گئی تھی جس

سے اس دور کی یاد قائم تھی۔افسوس کہ وہ بھی گل ہوگئی۔مرحوم مولانا شبلی کے شاگرد رشید، دارالمصنّفین کے پرانے رکن رکین اور اس کے علمی کاموں میں حضرت الاستاذ کے دست راست تھے۔ایک زمانے میں دونوں کا نام ساتھ لیا جاتا تھا۔وہ دارالمصنّفین کے قیام کے ساتھ ہی اس سے وابستہ ہوگئے تھے اور مر کر اس سے جدا ہوئے ...... ہندوستان کے نامور مصنفین میں ان کا شمار ہوا۔ان کی تصانیف نے دوسروں کو مصنف اور ادیب وانشاء پرداز بنادیا۔ملک کا علمی مذاق بنانے میں ان کا بھی حصہ ہے۔ان کی قوت اخذ بڑی تیز تھی، سرسری مطالعہ سے کتابوں کا جوہر کھینچ لیا کرتے تھے، قلم برداشتہ لکھتے تھے اور اس پر نظر ثانی اور فکر واصلاح کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی، ان کا مسودہ اول ہی مبیضہ ہوتا تھا۔قلم کی یہ پختگی کم مصنفین کو نصیب ہوتی ہے۔"(۱۲)

اس وفیاتی نوٹ کے بعد مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے ان کی سیرت وشخصیت، تصنیفات اور ادبی کمالات پر ایک مفصل مقالہ لکھا جو ماہنامہ معارف [جنوری ۱۹۵۷ء] میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ ان کے ادبی مضامین کے مجموعہ "ادبی نقوش" میں بھی شامل ہے۔اس میں شاہ صاحب نے مولانا کے فضل وکمال کے اعتراف کے ساتھ ان کی بعض بشری کمزوریوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ان کی بہت سی باتوں سے اختلاف کی گنجائش ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس سے ان کے معاندانہ رویے اور طرز عمل کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس دور میں علمائے دیوبند کا ترجمان ماہنامہ برہان دہلی سے نکلتا تھا۔اس علمی دنیا میں معارف ہی کی طرح بڑا وقار حاصل تھا۔افسوس کہ وہ معارف کے بعد نکلا اور اس سے پہلے مرحوم ہوگیا۔ جب تک مولانا سعید احمد اکبرآبادی اس کے مدیر رہے اس کا معیار باقی رہا۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی وفات کا واقعہ جس وقت پیش آیا مولانا سعید احمد اکبرآبادی برہان کے مدیر تھے، انہوں نے مولانا کا ماتم اس طرح کیا:

"گذشتہ مہینہ مولانا عبدالسلام ندوی کی وفات اردو زبان کے علمی وادبی

حلقوں میں ایک بڑا المناک سانحہ ہے۔ مرحوم کا سب سے بڑا وصف اور کمال جس میں مشکل ہی سے کوئی ان کا حریف ہوگا یہ تھا کہ وہ صرف ایک نامور مصنف، ادیب اور نقد سخن کے بہترین جوہری تھے۔ اس حیثیت سے وہ لیلائے علم و ادب کو مخاطب کر کے بجا طور پر کہہ سکتے ہیں:

سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا (۱۳)

دارالمصنّفین کے سابق رفیق اور مقدمہ رقعات عالمگیر کے مصنف سید نجیب اشرف ندوی مدیر نوائے ادب بمبئی نے ان لفظوں میں آنسو بہائے:

''آہ کہ شبلی کی بزم ادب و تحقیق کی آخری شمع بھی ۴/اکتوبر (۱۹۵۶ء) کی رات کو ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔ مولانا عبدالسلام ندوی ایک نقاد، ایک مورخ، ایک سیرت نگار، ایک شاعر اور بلند پایہ انشا پرداز ہی نہ تھے بلکہ انسانیت اور اخلاق کی حیثیت سے ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ .... وفاداری اور خاموشی سے ادارہ کی خدمات انجام دیتے رہے کہ مرتے دم استاد کا آستانہ نہ چھوڑا۔ ان کی سعادت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اسوہ صحابہؓ، اسوہ صحابیاتؓ اور شعرالہند کے مصنف کی آرام گاہ بھی سیرت النبیؐ، الفاروق اور شعرالعجم کے مصنف کے پہلو میں ہو۔ اللہ پاک اپنے جوار رحمت میں انہیں ابدی راحت وآرام عطا فرمائے۔'' (۱۴)

علی جواد زیدی اس وقت ماہنامہ نیا دور لکھنو کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے مولانا کی وفات پر ادارتی نوٹ میں لکھا کہ:

''اردو کی محفل ادب بڑی تیزی سے خالی ہوئی جارہی ہے اور جو اٹھتا ہے وہ اپنے ساتھ بہت سی رنگینیاں اور دلچسپیاں بھی لے جاتا ہے۔ جن لوگوں نے مدتوں بساط ادب کو گرم رکھا وہ بھی آخر شبہ کی تاب نہ لا کر چپکے سے اٹھ گئے، بالخصوص اعظم گڑھ کی محفل آناً فاناً ویران ہوئی جارہی ہے۔ سلیمان و سہیل کا داغ ابھی تازہ ہی تھا کہ مولانا عبدالسلام ندوی ہمیشہ کے

لئے داغ مفارقت دے گئے۔''   [ماہنامہ نیا دور لکھنو نومبر ۱۹۵۶ء]

مگر بحیثیت مجموعی اس قدر ماتم نہیں ہوا جس کے مولانا مستحق تھے۔اس کی بنیادی وجہ مولانا عبدالسلام ندوی کی گوشہ نشینی، عزلت پسندی اور شہرت و مقبولیت کے جذبات سے عاری ان کی زندگی تھی۔لیکن یہ ایک افسوس ناک پہلو ضرور ہے کہ جس شخص نے پچاس برس تک اقلیم شعر و ادب سے رشتہ استوار رکھا۔ بعد از مرگ اسے اقلیم ادب کے تاجداروں نے نظر انداز کیا۔ البتہ ۱۹۵۷ء میں نقوش لاہور کا شخصیات نمبر حصہ دوم شائع ہوا تو اس میں ایک قدرے مفصل مضمون محمد عبداللہ قریشی کے قلم سے شائع ہوا۔

مولانا کی وفات کے دو ماہ بعد پروفیسر کبیر احمد جائسی کا ایک مقالہ ''مولانا عبدالسلام ندوی اور ان کی شاعری'' ماہنامہ آج کل دہلی [دسمبر ۱۹۵۶ء] میں شائع ہوا اور اس زمانہ میں جائسی صاحب کا ایک طویل مضمون مطالعہ و تاثرات کے عنوان سے نیاز فتحپوری کے رسالہ نگار لکھنؤ [اگست ستمبر ۱۹۵۹ء] میں شائع ہوا۔ پھر دو سال بعد جائسی صاحب ہی کی کوششوں سے شبلی کالج میگزین کا عبدالسلام نمبر شائع ہوا جس میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا وہ مضمون جو ماہنامہ معارف جنوری ۱۹۵۷ء میں لکھا گیا تھا شامل ہے۔ البتہ مولانا سعید انصاری، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، علی حماد عباسی اور خود کبیر احمد جائسی کے نئے مضامین شامل ہیں۔ ان میں مولانا سعید انصاری کا گراں قدر مقالہ بھی شامل ہے۔ جس میں پہلی بار مولانا کی جامعیت اور اولیات کا ذکر قدرے تفصیل سے ہے۔ اس خصوصی شمارہ میں صباح الدین صاحب کا جو مفصل مقالہ ''میرے مولوی صاحب'' کے عنوان سے شامل ہے وہ کئی حیثیتوں سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اس میں مولانا کے شب و روز اور روزمرہ کے بہت سے واقعات درج ہیں اور ان کے فضل و کمال کے بھی عمدہ مرقعے آ گئے ہیں۔ یہاں اس کے دو اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مولوی صاحب دارالمصنّفین کے بانیوں میں تھے۔ حضرت سید صاحب اور وہ اس ادارہ کے افق پر علمی حیثیت سے مہر و ماہ بن کر چمکے۔ دونوں علامہ شبلی کے علمی جلال و جمال کے مظہر تھے۔ دونوں نے مل کر اپنے استاذ کے مشن کی تکمیل کی۔ دونوں میں سے کس نے زیادہ لکھا اس کا فیصلہ

صفحات کی گنتی کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔لیکن اس علمی اشتراک و یک جہتی کے باوجود دونوں میں بڑا فرق رہا۔ایک صرف علم کے لئے تھا۔ دوسرے کے لئے علم خود تھا۔''(۱۵)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''وہ جب اردو شعر و شاعری پر لکھنے بیٹھتے تو ان کا قلم طاؤس کی طرح رقص کرنے لگتا۔ان کی شعر الہند اردو زبان کی مایہ ناز تصانیف میں سے ہے اور یہ اسی صف میں رکھے جانے کے لائق ہے جہاں آب حیات، مقدمہ شعر و شاعری اور شعر العجم رکھی جاتی ہیں۔آخر الذکر تینوں کتابوں کے علمی و ادبی پایہ کو کم کرنے کی خاطر خدا جانے کتنی یلغاریں ہوئیں، لیکن پھر بھی یہ اردو کے ادب العالیہ میں شمار ہوتی ہے۔اسی طرح شعر الہند پر بھی تنقید و تنقیص کی چنگاریاں برابر برسائی جارہی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ چمنستان اردو کا سدا بہار پھول ہے۔''(۱۶)

یہ طویل مضمون ان کی کتاب بزم رفتگاں کے حصہ دوم میں بھی شامل ہے۔یہ مضمون باریک بینی سے مطالعہ کے لائق ہے، اس لئے کہ صباح الدین صاحب نے مولانا کی صاف ستھری زندگی پر بہت سے دھبے لگادئے ہیں۔بحیثیت مجموعی اس مضمون سے ان کی جو شبیہ بنتی ہے، وہ ایک لا ابالی اور جنون میں مبتلا شخص کی معلوم ہوتی ہے۔

اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں پروفیسر کبیر احمد جائسی نے ماہنامہ ادیب کا ایک شمارہ ذکر عبدالسلام کے نام سے شائع کیا۔یہ اصلاً جائسی صاحب کی مکمل کتاب ہے کیونکہ اس شمارے میں جائسی صاحب کے علاوہ کسی اور کی کوئی تحریر شامل نہیں ہے، حتیٰ کہ ماہنامہ ادیب کے مدیر ڈاکٹر ابن فرید کا اداریہ بھی شامل نہیں۔البتہ آخر میں چند کتابوں پر تبصرے ضرور شامل ہیں۔اس میں مولانا عبدالسلام ندوی کی حیات و خدمات کا ایک اجمالی مرقع آ گیا ہے۔''کچھ یادیں کچھ آنسو'' کے عنوان سے جائسی صاحب نے بڑی پرسوز تحریر لکھی ہے۔ادیب کا یہ شمارہ پچاس باون برس قبل شائع ہوا تھا اور اب اس کے مرتب بھی اس دنیا میں نہیں رہے اس لئے ضرورت ہے کہ اسے نئے سرے

سے مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ ذکر عبدالسلام کے بعد ایک عرصہ تک مولانا عبدالسلام ندوی کی شخصیت اور خدمات پر کچھ نہیں لکھا گیا۔ البتہ جائسی صاحب کی کوششوں سے ایم فل. اور پی ایچ. ڈی. کے دو مقالے ضرور لکھے گئے۔ ایم فل. کا مقالہ انگریزی میں غضنفر علی نے لکھا جسے ۱۹۹۵ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے شائع کیا اور پی ایچ. ڈی. کے لئے ڈاکٹر شباب الدین صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بڑا معیاری مقالہ لکھا جسے شبلی نیشنل کالج کے شعبہ اردو نے ۱۹۹۷ء میں شائع کیا۔ اس کے مشمولات یہ ہیں:

۱۔ حرف آغاز
۲۔ نقش حیات
۳۔ شخصیت
۴۔ شعرالہند
۵۔ اقبال کامل
۶۔ مقالات عبدالسلام
۷۔ حرف آخر
۸۔ ضمیمہ

مولانا عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات پر ڈاکٹر شباب الدین صاحب کا مقالہ علی العموم پسند کیا گیا۔ چونکہ اس میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے مقالات کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے، اس لئے ایک حلقے میں اس کا ذکر معاندانہ انداز میں رہا۔ البتہ کچھ اہل علم ایسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ ڈاکٹر شباب الدین صاحب نے مولانا عبدالسلام ندوی کے ساتھ معاندانہ رویہ رکھنے والوں کی تحریروں پر کھل کر نقد نہیں کیا گیا ہے۔

۱۹۷۷ء میں پروفیسر خورشید نعمانی رودولوی کا پی ایچ، ڈی کا مقالہ ''دارالمصنّفین کی ادبی خدمات'' بمبئی سے شائع ہوا۔ خورشید نعمانی صاحب شبلی کالج کے طالب علم اور عرصہ تک دارالمصنّفین کے احاطہ میں مقیم رہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کے ساتھ ان کے شب وروز گذرے ہیں۔ وہ مولانا کے انتقال کے وقت ان کے پاس تھے۔ غرض وہ مولانا سے بخوبی واقف ہیں، چونکہ

موضوع کے لحاظ سے بھی ضروری تھا اس لئے انہوں نے اپنے مقالے میں مولانا عبدالسلام ندوی کا بکثرت تذکرہ کیا اوران کی کئی کتابوں پر نقد وتبصرہ کیا ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے:

ا۔	مولانا عبدالسلام ندوی	۵۳-۵۶
۲۔	شعرالہند	۱۴۰-۱۴۹
۳۔	اقبال کامل	۱۵۰-۱۵۹
۴۔	مقالات عبدالسلام	۱۷۰-۱۷۱
۵۔	اسوۂ صحابہؓ	۱۷۳-۱۷۴
۶۔	اسوۂ صحابیاتؓ	۲۷۴-۲۷۵
۷۔	سیرت عمر بن عبدالعزیز	۲۷۶-۲۷۷
۸۔	انقلاب الامم	۲۸۶
۹۔	القضا فی الاسلام	۲۸۶
۱۰۔	تاریخ اخلاق اسلامی	۲۸۷-۲۸۸

یہ تفصیل ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری مرحوم کی تیار کردہ ہے۔

۱۹۷۴ء میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے حیات سلیمان لکھی۔ یہ مولانا سید سلیمان ندوی کی مفصل سوانح عمری ہے۔اس میں ان کے احباب کا بھی ذکر ہے۔سید صاحب کا مولانا عبدالسلام ندوی سے بڑا کون حبیب رہا ہوگا۔ چالیس- پینتالیس برس کا ساتھ رہا مگر ان کے ذکر میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

’’احباب میں ایک نام مولانا عبد السلام ندوی کا بھی ہے، وہ بڑے بھولے بھالے، لا ابالی اور مجلسی آداب ورسوم سے بے نیاز تھے،ان میں نہ دوست بننے کی صلاحیت تھی اور نہ دوست بنانے کی لیکن سید صاحب کے پچاس سال کے رفیق تھے، طالب علمی کے زمانہ سے سید صاحب کے پاکستان جانے تک ساتھ رہا، دارالمصنّفین کے آغاز سے لے کر موت تک اس سے وابستہ رہے اوراس کے مصنّفین میں سید صاحب کے بعد علمی دنیا

میں ان ہی کا نام لیا جاتا تھا، وہ بڑے بھولے تھے، ہر شخص ان کے بھولے پن سے لطف لیتا تھا، سید صاحب بھی لطف اندوز ہوتے تھے اور ان کی آزادروی کی بنا پر ان کو ''بت بے پیر'' فرمایا کرتے تھے، ان کے بہت سے لطائف وظرائف ہیں، ۱۹۵۶ء میں انتقال کیا اور دارالمصنّفین میں دفن ہوئے۔'' (حیات سلیمان ص۵۲۴)

مگر سید صاحب نے جہاں ان کا ذکر کیا ہے احترام سے کیا ہے، البتہ شاہ صاحب اور ان کے حبیب خاص صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے جہاں مولانا کا ذکر کیا ہے کچھ نہ کچھ بے جا جملے ضرور لکھے ہیں۔ سنا تھا کہ شرافت، انکساری اور سادگی انسان کو اعلیٰ درجہ عطا کرتی ہے مگر مولانا کی سادگی وشرافت ہی ان کو لاابالی بنا گئی۔ دراصل شاہ صاحب کا دور علمی دارالمصنّفین کی تاریخ کا بڑی کشمکش کا دور ہے۔ اسی میں مولانا عبدالسلام ندوی بے دست و پا ہوئے، مولانا ریاست علی ندوی دارالمصنّفین سے علاحدہ ہوئے، حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندوی کو نکالا گیا، تب جاکے زمام کار جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے ہاتھوں میں آئی۔ بہرحال شاہ صاحب نے مولانا عبدالسلام ندوی کے علمی کارناموں کا حیات سلیمان میں سلیقے سے ذکر نہیں کیا۔ اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ عبدالسلام شناسی کا سلسلہ قائم نہ ہوسکا اور مولانا مرحوم کی گراں قدر خدمات کا پورے طور پر مطالعہ وجائزہ نہیں لیا جاسکا۔

دارالمصنّفین کے شعبہ تصحیح سے وابستہ ابوعلی اثری مرحوم جو اس ادارہ کے ابتدائی دور میں اس سے وابستہ ہوئے تھے اور جن کا مولانا عبدالسلام ندوی کا بڑا ساتھ رہا تھا اور جنہوں نے شبلی، سید صاحب، مولانا آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی اور دارالمصنّفین کی خدمات پر کثرت سے مضامین لکھے ہیں۔ انہوں نے ایک عرصہ بعد مولانا کی شخصیت اور امتیازات پر ایک تفصیلی مضمون لکھا جو ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ [فروری ۱۹۸۷ء] میں شائع ہوا۔

سنہ ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۵ء تک مولانا عبدالسلام ندوی پر ملک کے رسائل و جرائد میں شاید ہی کچھ لکھا گیا ہو۔ ۱۹۹۵ء میں راقم کا مقالہ ''مولانا عبدالسلام ندوی کی تصنیفات وتالیفات اور تراجم'' سہ ماہی فکر ونظر اسلام آباد میں شائع ہوا۔ اس کو اہل علم نے سراہا، اس کے بعد برادر عزیز

مولانا کلیم صفات اصلاحی نے مولانا عبدالسلام ندوی کی ایک قدیم کتاب تاریخ الحرمین شریفین کے جائزے پر مشتمل مفصل مقالہ ماہنامہ معارف میں لکھا، بعدازاں ایک اور مقالہ مولانا عبدالسلام ندوی کی قرآنی خدمات سپرد قلم کیا جو اپنے موضوع پر پہلا مقالہ ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی نے ''مولانا عبدالسلام ندوی ماہر قرآنیات وادبیات''، لکھی۔

اکیسویں صدی کے آغاز پر مولانا عبدالسلام ندوی کے بعض اعزہ جس میں ان کے بھتیجے شمیم احمد مرحوم اور پوتے محمد ہارون صاحب پیش پیش تھے، مولانا عبدالسلام ندوی کی حیات و خدمات پر بمبئی میں ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا اور ملک کے نامور اہل علم وقلم کو مقالہ خوانی کی دعوت دی۔ یہ سمینار عبدالسلام شناسی کی راہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کامیاب سمینار میں نہ صرف ملک کے متعدد ممتاز اہل قلم نے شرکت کی بلکہ اسی سمینار میں مولانا کے افکار وخیالات اور ان کی تحریروں کی اشاعت کے لئے مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا جس کے سربراہ جناب محمد ہارون صاحب نامزد ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے اس سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ شائع کیا۔ جس میں مندرجہ ذیل مقالات شامل ہیں:

۱۔	مولانا عبدالسلام ندوی (نقوش حیات)	مولانا ضیاءالدین اصلاحی
۲۔	مولانا عبدالسلام ندوی مورخ، مترجم اور مقالہ نگار کی حیثیت سے	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
۳۔	عبدالسلام ندوی بحیثیت ماہر اقبالیات	ڈاکٹر عبدالمغنی
۴۔	دارالمصنّفین، مولانا عبدالسلام ندوی اور اقبال کامل	ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی
۵۔	مولانا عبدالسلام ندوی ادیب ونقاد اور محقق کی حیثیت سے	ڈاکٹر خلیق انجم
۶۔	مولانا عبدالسلام ندوی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ	محبوب الرحمٰن فاروقی
۷۔	عربی زبان وادب وتراجم اور مولانا عبدالسلام ندوی	ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

۸۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی اردو، فارسی اور عربی زبان وادب کی خدمات (شعر الہند اور مقالات کی روشنی میں) — پروفیسر محمد شعیب اعظمی
۹۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی انشاء پردازی — جناب شمیم طارق
۱۰۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی غیر مطبوعہ تصانیف — پرفیسر کبیر احمد جائسی
۱۱۔ آثار عبدالسلام — ڈاکٹر ضیاءالدین انصاری
۱۲۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی مذہبی نگارشات — مولانا محمد عارف عمری
۱۳۔ مولانا عبدالسلام ندویؒ تصنیفات، تالیفات اور تراجم — ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
۱۴۔ مولانا عبدالسلام ندوی اپنے اساتذہ، معاصرین اور رفقاء کی نظر میں — پروفیسر خورشید نعمانی
۱۵۔ فلسفہ کلام اور مولانا عبدالسلام ندوی — مولانا عمیر الصدیق ندوی

اس کے بعد سے مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن مسلسل سرگرم عمل ہے۔ ۲۰۰۹ء میں فاؤنڈیشن کی جانب سے دوسرا سمینار ''مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عہد حاضر'' کے عنوان سے جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ میں منعقد کیا گیا۔ اس میں بھی ملک کے متعدد ممتاز اہل علم نے شرکت کی اور بڑے عمدہ تحقیقی مقالے پیش کئے۔ ہارون صاحب نے اس سمینار کے مقالات کا مجموعہ بھی شائع کیا۔ اس میں درج ذیل مقالات شامل ہیں:

۱۔ مولانا کاتبی نیشاپوری کی تصانیف پر مولانا عبدالسلام ندوی کی ناقدانہ نظر — پروفیسر کبیر احمد جائسی
۲۔ مولانا عبدالسلام ندوی آزاد بھارت کے پہلے اقبال شناس — پروفیسر عبدالحق
۳۔ ادبی موضوعات میں عبدالسلام ندوی کی اولیات — شمیم طارق
۴۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا تجدیدی کارنامہ — مولانا نظام الدین اصلاحی

۵۔	مولانا عبدالسلام ندوی: عصر اور دانشوری	عمیر الصدیق ندوی
۶۔	مولانا عبدالسلام ندوی کی خدمت اقدس میں چند ماہ وسال	پروفیسر خورشید نعمانی
۷۔	فلسفۂ اعجاز قرآن [مولانا عبدالسلام ندوی اور بعض معاصرین کا مطالعہ]	ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی
۸۔	مولانا عبدالسلام ندوی اور ہم	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی
۹۔	شعر الہند کی افادیت	ڈاکٹر شباب الدین
۱۰۔	علامہ شبلی کے علمی منصوبوں کی تکمیل میں مولانا عبدالسلام ندویؒ کا حصہ	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
۱۱۔	مولانا عبدالسلام ندویؒ کے چند تفسیری مباحث	نعیم الدین اصلاحی
۱۲۔	تاریخ اخلاق اسلامی، مولانا عبدالسلام ندوی کی ایک منفرد تصنیف	محمد عمر اسلم اصلاحی
۱۳۔	اسوۂ صحابہ: مثالی اسلامی معاشرے کی تصویر	ڈاکٹر محمد ارشد
۱۴۔	مولانا عبدالسلام ندوی کے تعلیمی افکار وتحقیقات	کلیم صفات اصلاحی
۱۵۔	تصوف کی اجمالی تاریخ۔ایک تجزیاتی مطالعہ	اعجاز احمد قاسمی سہرساوی
۱۶۔	اعجازِ قرآن اور مولانا عبدالسلام ندویؒ	نسیم ظہیر اصلاحی
۱۷۔	اقبال کامل: ایک مطالعہ	عمیر منظر

مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن ممبئی کے صدر جناب محمد ہارون صاحب صابو صدیق پالی ٹیکنک سے سول انجینئرنگ میں ڈپلوما ہیں اور اسی مادر علمی کے پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دے کر سبکدوش ہوئے ہیں۔انہوں نے فاؤنڈیشن کی ترقی کو اپنی زندگی کا مقصد اور مشن بنا لیا ہے اور مسلسل سرگرم عمل ہیں۔انہیں مولانا عبدالسلام ندوی سے فطری طور پر بڑی عقیدت ہے۔ انہوں نے فاؤنڈیشن کی جانب سے نہ صرف کامیاب سمینار کا انعقاد کیا بلکہ مولانا عبدالسلام ندوی کے کئی مسلسل مضامین کو کتابی صورت میں شائع کیا۔بعض اہل علم نے مولانا پر جو کتابیں لکھیں انہیں

بھی بڑے اہتمام سے شائع کیا۔اس فاؤنڈیشن نے اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شائع کی ہیں:

۱۔	مجموعہ مقالات۔مولانا عبدالسلام ندوی حیات اور علمی فتوحات سمینار	مرتب محمد ہارون
۲۔	تصوف کی اجمالی تاریخ	مولانا عبدالسلام ندوی
۳۔	مکاتیب واشعار مولانا عبدالسلام ندوی	پروفیسر کبیر احمد جائسی
۴۔	مولانا کاتبی نیشاپوری	مقدمہ پروفیسر کبیر احمد جائسی
۵۔	مشرقی کتب خانے	مقدمہ شمیم طارق
۶۔	مولانا عبدالسلام ندوی: ماہر قرآنیات وادبیات	ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
۷۔	مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عہد حاضر	محمد ہارون

جناب محمد ہارون صاحب کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ انہوں نے نہ صرف کتابیں شائع کیں بلکہ ان کو اہل علم تک پہونچایا اور متعدد اہل قلم سے ان کا تعارف وتجزیہ شائع کرایا۔اس سلسلہ کی ان کی ایک کوشش ماہنامہ شاعر ممبئی میں مولانا عبدالسلام ندوی پر خصوصی گوشہ کی اشاعت بھی ہے۔

دارالمصنّفین جہاں مولانا عبدالسلام ندوی نے زندگی کا بیشتر حصہ گذارا۔اس کے اس وقت کے ناظم اور رفقاء نے چند مضامین کے سوا کوئی علمی کام نہیں کیا بلکہ ان کی غیر مطبوعہ کتابوں کے ساتھ بھی اعتنا نہ کیا۔البتہ مولانا کی تقریباً دو درجن وہ کتابیں جو دارالمصنّفین کے سلسلہ اشاعت میں شامل ہیں، انہیں دارالمصنّفین نے ہمیشہ بڑی اہمیت کے ساتھ شائع کیا اور مالی دقتوں اور دشواریوں کے باوجود ایک ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع کئے۔ان کے ادبی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ مقالات عبدالسلام شائع کیا۔بعض کمیوں کے باوجود فکر عبدالسلام کو اصلاً اسی ادارہ نے زندہ رکھا ہے۔

پاکستان میں مولانا عبدالسلام ندوی کی حیات وخدمات پر چند مضامین اور دو مقالات لکھے جانے کے سوا معلومات دستیاب نہیں۔

ا۔علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں ایک ایم فل کا مقالہ ۲۰۰۸ء میں جمع ہوا ہے۔اس کی PDF کاپی انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔ یہ مقالہ محترمہ شائستہ بتول نے لکھا ہے۔اس کا عنوان ''اقبال کامل ازمولانا عبدالسلام ندوی کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' ہے۔۲۵۲ صفحات پر مشتمل یہ مقالہ ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کی زیرنگرانی جمع ہوا ہے۔اس کے ابواب یہ ہیں:

باب اول: مختصر سوانحی خاکہ

باب دوم: اقبال کامل حصہ اول سوانحی حالات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

اقبال کامل کے بنیادی وثانوی ماخذ کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

باب سوم: اقبال کامل حصہ دوم فن وشاعری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

باب چہارم: اقبال کامل حصہ سوم، فکر وفلسفہ کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

باب پنجم: اقبال کامل کا مقام ومرتبہ

مقالہ نگار محترمہ شائستہ بتول نے اقبال کامل کے مشمولات کا مفصل جائزہ لے کر اس کے بعض غلط اندراجات کی نشاندہی کی ہے۔اور جدید مآخذ سے اس کی تصحیح کا کام بھی کیا ہے۔ان کا یہ خیال صحیح ہے کہ جس وقت اقبال کامل لکھی گئی اقبالیاتی ادب محدود تھا۔اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کامل میں اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔مصنفہ کا یہ بھی خیال ہے کہ اس کی اشاعت میں شائع کرنے والوں نے کانٹ چھانٹ کی، جس کی وجہ سے کتاب میں بے ربطی پیدا ہوئی۔ ہر پہلو سے جائزہ کے بعد مقالہ نگار اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ

> ''مولانا عبدالسلام ندوی نے اقبال کے سوانحی حالات، فلسفہ، ان کی اردو فارسی شاعری اور ان کے تصورات ونظریات کا بھرپور انداز میں جائزہ لیا ہے۔اقبال کے افکار کی اتنی واضح اور اچھے انداز میں تشریح وتوضیح پیش کی ہے جو اقبال کے کسی ناقد کے ہاں نظر نہیں آتی۔'' (ص ۲۳۸)

محترمہ شائستہ بتول نے بعض بڑے اہل علم وادب اور ماہرین اقبالیات کے خیالات بھی اپنے موقف کی تائید میں نقل کئے ہیں۔ان میں ایک نام ماہر اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا بھی ہے۔ان کا درج ذیل اقتباس نقل کیا گیا ہے:

''اردو کا ایسا کون سا طالب علم جو مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کے علمی کمالات سے واقف نہیں ہوگا۔ایک مدت ہوئی عبدالسلام ندوی مرحوم کی کتاب اقبال کامل میرے زیر مطالعہ رہی۔میرے نظر میں اقبال کامل (جو علامہ اقبال کی حیات پر مشتمل ہے۔)اس وقت بھی اقبال پر لکھی ہوئی بہترین کتابوں میں تھی اور آج بھی اقبال سے متعلق بہترین کتابوں میں ہے۔'' (تعمیر فکر ص۲۱۰)

غرض اقبال کامل کا یہ ایک عمدہ تحقیقی مطالعہ و تجزیہ ہے۔

دوسری کتاب محترمہ ڈاکٹر گلشن طارق نے ''عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات'' لکھی ہے۔یہ دراصل ان کا پی ایچ ،ڈی کا مقالہ ہے۔حال ہی میں [۲۰۱۳ء] شائع ہوئی ہے۔یہ مولانا عبدالسلام ندوی پر لکھی جانے والی والی کتابوں میں سب سے مفصل اور سب سے اہم کتاب ہے۔ ۶۰۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مولانا عبدالسلام ندوی کی حیات و خدمات اور ان کی علمی و ادبی کارناموں کا شاید ہی کوئی گوشہ چھوٹا ہو۔اس کا دیباچہ ماہر اقبالیات ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے قلم سے ہے۔دوسری تحریر مشہور محقق ڈاکٹر سلیم اختر کی شامل کی گئی ہے۔انہوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کو اقبال شناسی کے آسمان کا تابندہ ستارہ قرار دیا ہے۔

حواشی

(۱) مکاتیب شبلی اول ص۲۴۲

(۲) الہلال، ۳۰ر ستمبر ۱۹۱۴ء۔مضمون ''الحرب'' ص۲۹۲

(۳) ماہنامہ معارف، نومبر ۱۹۳۵ء

(۴) ایضاً

(۵) تنقیدات عبدالحق ص۱۵۶

(۶) تاریخ ادب کی تدوین ص۴۶

(۷) اردو تنقید پر ایک نظر ص۲۷

(۸) ایضاً ص۴۷

(۹) افکارنوص ۱۸۷

(۱۰) نگار، بھوپال فروری ۱۹۲۶ء ص۶۲-۶۳

(۱۱) تاریخ ادب اردو، حصہ نثر ص۵۷۔ طبع دوم لکھنؤ ۱۹۲۹ء

(۱۲) ماہنامہ معارف اکتوبر ۱۹۵۶ء ص۲۴۲

(۱۳) ماہنامہ برہان دہلی، نظرات۔ نومبر ۱۹۵۶ء ص۲۵۹

(۱۴) نوائے ادب بمبئی، شذرات اکتوبر ۱۹۵۶ء ص۳-۴

(۱۵) مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں ص۳۵

(۱۶) مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں ص۵۴

کتابیات

۱۔ اسوۂ صحابہؓ، اول۔ مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۱ء

۲۔ اسوۂ صحابہؓ، حصہ دوم، مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۲۲ء

۳۔ اسوۂ صحابیاتؓ، مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۷ء

۴۔ افکار سہیل، علی حماد عباسی رشوکت سلطان، شبلی کالج اعظم گڑھ، ۱۹۵۷ء

۵۔ افکار نو، فیض الرحمٰن اعظمی، اردو مرکز، اردو بازار دہلی، ۱۹۶۲ء

۶۔ انقلاب الامم، مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۴۵ء

۷۔ اقبال کامل، مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۷۵ء

۸۔ اقبال کامل از عبدالسلام ندوی کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، شائستہ بتول، ۲۰۰۸ء غیر مطبوعہ

۹۔ امام رازی، مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء

۱۰۔ اسلامی قانون فوجداری، مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۲۹ء

۱۱۔ القضائی الاسلام، مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۲۹ء

۱۲۔ ابن خلدون، مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۴۰ء

۱۳۔ التربیۃ الاستقلالیہ، مولانا عبدالسلام ندویؒ، ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، ۱۹۲۶ء

۱۴۔ ادبی نقوش، مولانا شاہ معین الدین ندوی، ادارہ فروغ اردو لکھنو ۱۹۶۰ء

۱۵۔ اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، بک امپوریم پٹنہ ۱۹۶۰ء

۱۶۔ بہار، الیاس احمد، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۳۴ء

۱۷۔ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، منشی تیج کمار لکھنو، ۱۹۶۹ء

۱۸۔ تاریخ ادب کی تدوین، علی جواد زیدی، نصرت پبلشرز لکھنو، طبع دوم، ۱۹۸۳ء

۱۹۔ تذکرہ علمائے اعظم گڑھ، مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی، جامعہ اسلامیہ، بنارس، ۱۹۷۶ء
۲۰۔ تاریخ فقہ اسلامی، مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۱ء
۲۱۔ تاریخ الحرمین الشریفین، مولانا عبدالسلام ندویؒ، صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی، پنجاب ۱۹۲۳ء
۲۲۔ تاریخ اخلاق اسلامی، مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء
۲۳۔ تجار عراق، مولانا ضمیر احمد قدسی، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۲۸ء
۲۴۔ تذکرہ شعرائے اتر پردیش، عرفان عباسی، نامی پریس لکھنو، ۱۹۸۲ء
۲۵۔ تعمیر فکر، جگن ناتھ آزاد، کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، جموں ۲۰۰۳ء
۲۶۔ تنقیدات عبدالحق، مولوی عبدالحق، مکتبہ چنگاری دہلی، ۱۹۵۶ء
۲۷۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۱۹۸۴ء
۲۸۔ حیات شبلی، مولانا عبدالسلام ندویؒ، مسودہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء
۲۹۔ حیرۃ الفقہ، قاضی عبدالرحمٰن حیرت، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۲۹ء
۳۰۔ حیات سلیمان، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء
۳۱۔ حکمائے اسلام، حصہ اول، مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۳ء
۳۲۔ حکمائے اسلام، حصہ دوم، مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء
۳۳۔ چندار باب کمال، مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء
۳۴۔ دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات، محمد الیاس الاعظمی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۲ء
۳۵۔ دارالمصنّفین کی ادبی خدمات، پروفیسر خورشید نعمانی، رحیمی پریس ممبئی ۱۹۷۷ء
۳۶۔ دارالمصنّفین کی ادبی خدمات کا تعارف، ڈاکٹر شباب الدین، شبلی کالج اعظم گڑھ ۲۰۰۸ء
۳۷۔ دارالمصنّفین کی تاریخ اور علمی خدمات (جلد اول و دوم) پروفیسر خورشید نعمانی دارالمصنّفین، اعظم گڑھ

۳۸۔ دبستان شبلی کے نامور انشاپرداز، اثر انصاری، نکھار پبلی کیشن مئو، ۱۹۹۰ء
۳۹۔ رہنمائے تاریخ اردو، حاجی محمد عبدالقادر، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۳۸ء
۴۰۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز، مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۴۶ء
۴۱۔ سیرۃ النبی جلد ششم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۶ء
۴۲۔ شاہ معین الدین احمد ندوی حیات وخدمات، محمد الیاس اعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ ۲۰۰۷ء
۴۳۔ شبلی کالج کا مایہ ناز فرزند، ڈاکٹر شباب الدین، شبلی کالج اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء
۴۴۔ شعرالہند (اول) مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۱ء
۴۵۔ شعرالہند (دوم) مولانا عبدالسلام ندویؒ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء
۴۶۔ عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات، ڈاکٹر شباب الدین، شبلی کالج اعظم گڑھ، ۱۹۹۷ء
۴۷۔ عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات، ڈاکٹر گلشن طارق، ماورا، ۲۰۱۳ء
۴۸۔ عظمت کے نشاں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، طبع دوم، ۲۰۱۰ء
۴۹۔ عکس واثر، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء
۵۰۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۲۰۰۵ء
۵۱۔ غزلیات فارسی، سعید انصاری، شبلی مرکز لاہور ۱۹۵۶ء۔
۵۲۔ فکر اقبال، خلیفہ عبدالحکیم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۷ء
۵۳۔ فقرائے اسلام، مولانا عبدالسلام ندویؒ، صوفی پرنٹنگ پبلشنگ کمپنی پنجاب ۱۹۲۵ء
۵۴۔ فطرت نسوانی، مولانا عبدالسلام ندوی، صوفی پرنٹنگ پبلشنگ کمپنی پنجاب
۵۵۔ کبیر احمد جائسی کی علمی وادبی خدمات، ڈاکٹر شباب الدین، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء
۵۶۔ مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، مولانا عمران خان ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۴۶ء
۵۷۔ مشاہیر کے خطوط، شائع کردہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء
۵۸۔ مکاتیب واشعار مولانا عبدالسلام ندویؒ، کبیر احمد جائسی
مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، ممبئی، ۲۰۰۶ء
۵۹۔ مقالات عبدالسلام، مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء

۶۰۔ مقالات مولانا عبدالسلام ندوی سمینار، محمد ہارون
مولانا عبدالسلام ندویؒ فاؤنڈیشن، ممبئی، ۲۰۰۶ء
۶۱۔ مکاتیب شبلی، حصہ اول، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۲۸ء
۶۲۔ مکاتیب شبلی، حصہ دوم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء
۶۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط و جوابات، محمد اجمل، سنگم کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۶ء
۶۴۔ مولانا عبدالسلام ندویؒ، کبیر احمد جائسی، ساہتیہ اکادمی دہلی، ۲۰۰۵ء
۶۵۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں، کبیر احمد جائسی، شبلی کالج میگزین، اعظم گڑھ، ۱۹۵۸ء
۶۶۔ مولانا کاتبی نیشاپوری، مولانا عبدالسلام ندوی
مولانا عبدالسلام ندویؒ فاؤنڈیشن، ممبئی، ۲۰۰۸ء
۶۷۔ مشرقی کتب خانے، مولانا عبدالسلام ندوی
مولانا عبدالسلام ندویؒ، فاؤنڈیشن، ممبئی، ۲۰۰۸ء
۶۸۔ مولانا عبدالسلام ندوی، ماہر قرآنیات و ادبیات، ابوسفیان اصلاحی
مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، ممبئی، ۲۰۰۸ء
۶۹۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عہد حاضر، محمد ہارون اعظمی
مولانا عبدالسلام ندویؒ فاؤنڈیشن ممبئی، ۲۰۰۹ء
۷۰۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے، سید صباح الدین عبدالرحمٰن
دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۶۳ء

رسائل

۷۱۔ آج کل دہلی (ماہنامہ) نومبر، دسمبر ۱۹۵۶ء
۷۲۔ ادیب علی گڑھ (عبدالسلام ندوی نمبر) دسمبر ۱۹۶۱ء
۷۳۔ اردو۔ اورنگ آباد۔ جنوری ۱۹۲۸ء
۷۴۔ الرشاد اعظم گڑھ، جنوری، فروری ۲۰۰۰ء

۷۵۔ الندوہ،لکھنو،مئی ۱۹۰۶ء

۷۶۔ الہلال کلکتہ،۳۰رستمبر۱۹۱۴ء

۷۷۔ ماہناہ برہان دہلی،نومبر ۱۹۵۶ء

۷۸۔ شبلی نیشنل کالج میگزین۔اعظم گڑھ(عبدالسلام ندوی کی یاد میں)۱۹۵۸ء

۷۹۔ فکرونظر،اسلام آباد،جولائی-ستمبر۱۹۹۵ء

۸۰۔ معارف،اعظم گڑھ: جولائی ۱۹۱۶ء،مارچ ۱۹۱۸ء،فروری ۱۹۱۹ء،جولائی ۱۹۲۲ء نومبر ۱۹۲۵ء،نومبر ۱۹۲۷ء،جولائی ۱۹۳۰ء،اگست ۱۹۳۵ء،نومبر ۱۹۳۵ء،اپریل ۱۹۳۶ء،جون ۱۹۴۱ء،اکتوبر ۱۹۵۶ء،نومبر ۱۹۵۶ء،اگست ۲۰۰۸ء

۸۱۔ نگار،فروری ۱۹۲۶ء

۸۲۔ نوائے ادب ممبئی،اکتوبر ۱۹۵۶ء